اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

دسمبر 2016

قندیل ادب

مدیر: رانا عبدالرزاق خان

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

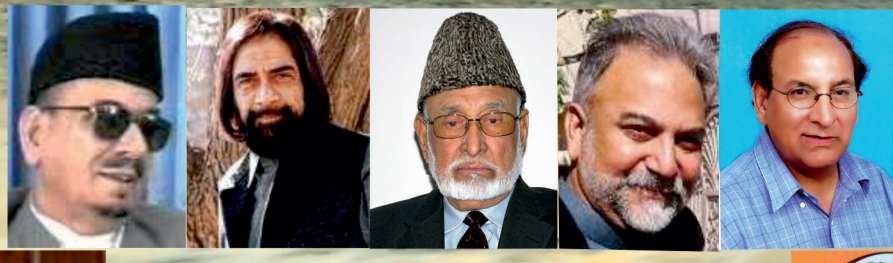

قندیل ادب کے چار سال

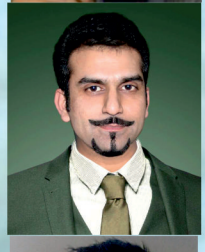

www.qindeel-e-adub.com

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

بانی رُکن: خان بشیر احمد رفیق مرحوم مدیر: رانا عبدالرزاق خاں معاون مدیر: سید حسن خان

مدیر خصوصی: سہیل لون مینجنگ ڈائریکٹر: عاصی صحرائی فوٹوگرافی: قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر آڈیو وڈیو: محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید

فہرست

آپ کے خطوط (ادارہ)		2
غزلیات		3-7
حضرت قائداعظمؒ چوہدری ظفراللہ خان	رانا عبدالرزاق خاں لندن	8
متقی امیر و منصف	بلال افتخار	11
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ	اقبال احمد نجم لندن	12
علماء دیوبند کی وہ کون سی گستاخیاں تھی	ادارہ	14
میری ماں	ملک ملک خداداد خان صاحب	15
گھروں میں بنتے مکان	ڈاکٹر علی عباس امید	16
مہندر سنگھ بیدی کے جوتے	نیلوفر فردوس	18
مذہب کے نام پر استحصال اخبار و جرائد	ادارہ	20
نظارہ درمیاں ہے	قرۃ العین حیدر	23
مسلمان بادشاہوں کا انجام	رانا عبدالرزاق خان لندن	26
حکمت کے موتی	ثقلین مبارک	28
مسکرایئے اور سیٹی ماریئے	محمد اسحٰق عاجز	32
پاکستانی عدل	عاصی صحرائی	33
پاکستانی اور جاپانی پولیس	عبدالقدیر کوکب	34
جب قرآن پہ پابندی لگی	رجل خوشاب	35
امام مہدی کا پاکستان آنا	اے آر راجپوت	36
نغموں کا شہنشاہ۔شکیل بدایونی	مشتاق جاوید	37
حاصلِ مطالعہ	عاصی صحرائی	40
ایک عظیم سائنسدان۔پروفیسر عبدالسلام	آصف علی پرویز	41-44

--*

آپ کے خطوط

عطاءالحئی۔چنیوٹ۔پاکستان سے لکھتے ہیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قندیل ادب انٹرنیشنل پڑھا۔ بڑے عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی ایسا رسالہ ہو جس میں اسلام اور ادب کا امتزاج ہو وہ آج مل ہی گیا۔اس طرح سے کہ کسی اپنے کے قلم سے جاری کیا گیا ہو تو پڑھنے میں ایک اپنائت کا اظہار ہوتا ہے۔میں عموماً رسالہ مکمل پڑھتا نہیں بس جستہ جستہ دیکھا اور آگے نکل گیا لیکن جب میں نے یہ رسالہ شروع کیا تو چھوڑا ہی نہ جا سکا ایسا لگا کہ رسالے کی کس دنیا میں جا پہنچا ہوں جب تک مکمل پڑھ نہیں لیا سکوں نہیں ملا۔خدا تعالی آپکی محنت اور محبت دونوں میں برکت ڈالے بہت خوشی ہوئی کہ آپ یہ کار خیر سرانجام دے رہے ہیں ایسے رسالہ دیکھ اور پڑھ کر جہاں بہت خوشی ہوتی ہے وہاں یہ ڈر سا آن کھڑا ہوتا ہے کہ کہیں یہ رسالہ بند ہی نہ ہو جائے۔جبکہ اب یہ ناممکن ہے جزاک اللہ و احسن اجزاء۔

(عطاءالحئی۔چنیوٹ۔پاکستان)

––*

محترمہ زبیدہ بشیر قاضی صاحبہ تحریر فرماتی ہیں

مدیر قندیل محترم رانا صاحب

السلام وعلیکم

آپ نے قندیل ادب نومبر میں محترم بشیر احمد رفیق صاحب کے متعلق بھی اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔کالم نگاری کرتے ہیں اور گوشہ ادب کے بھی مدیر ہیں۔حالاتِ حاضرہ کے متعلق بھی آپ کے مضامین پڑھتی رہتی ہوں۔20 پونڈ ارسال خدمت ہیں۔آپ کا اردو ادب پر احسان ہے۔خدا تعالیٰ آپ کو صحت وسلامتی عطا فرمائے۔

––*

اداریہ

قندیلِ ادب انٹرنیشنل کا پانچواں سال شروع

محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ قندیلِ ادب انٹرنیشنل لندن کا چوتھا سال مکمل ہو رہا ہے۔اس دوران کئی نشیب وفراز آئے۔مگر اللہ تعالیٰ نے پائے ثبات میں کوئی ذرّہ سی لغزش بھی آنے نہ دی ۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل
لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ساری دنیا سے دوستوں سے بہت محبت اور پذیرائی ملی۔بہت سے نام ہیں جن کا ذکر محض طوالت کی بنا پر چھوڑتا ہوں مگر ایک نام بی اے رفیق کا قابل ذکر ہے۔جو 11/اکتوبر سے ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔آمین۔انہوں نے اس رسالے کی ابتداء سے ہی میری ڈھارس بندھائی۔ہر قسم کی مدد اور تعاون کیا۔اچھے مضامین فراہم کئے۔بڑے بڑے لکھاریوں سے تعارف کروایا۔اور سب دوستوں کے ای میل ایڈریسز فراہم کئے۔اور خود یہ رسالہ ساری دنیا میں پھیلانے کا باعث ہوئے۔رسالے کے معیار اور معیاری مضامین پر ہمیشہ اُن کی توجہ رہتی۔پروف ریڈنگ پر ہمیشہ وہ سختی کرتے جو کہ کبھی بھی سو فی صد ٹھیک نہ ہوئی۔یہ رسالہ چونکہ صرف ادبی ذوق کی تسکین کے لئے ہے۔بعض اوقات اس میں کہیں نہ کہیں مذہبی اور سیاسی مضامین بھی آجاتے ہیں۔ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔یہ رسالہ کسی بھی فرقے یا مذہب، یا سیاسی پارٹی کا ترجمان نہیں اسلئے اس میں ادب کے متعلق ضرور لکھیں اور اپنی رائے اور مضامین ،غزلیں، وغیرہ ان پیج سافٹ ویئر میں کمپوز کر کے ارسال کرتے رہیں ادارہ آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

رانا عبدالرزاق خان

غزلیات

غزل

ڈاکٹر مختار الدین احمد مختارؔ

اتنی پہلے تو نہیں تھی ظلم پرور تیرگی
ایک قیامت ہے اندھیرا ایک محشر تیرگی

اس طرح پسپا ہوا ہے نار سے اس بار نور
شہر سارا جل رہا ہے اور گھر گھر تیرگی

اب وہ کہتا ہے کہ ہم اس سے خریدیں روشنی
جس نے پھیلائی ہے دنیا میں سراسر تیرگی

اُجلے چہرے، اُجلی پوشاکیں، ہیں اُجلے بام و در
جھانک کر دیکھا تو نکلی دل کے اندر تیرگی

ہاتھ میں اندھے کے مشعل ہو تو لگ جائے گی آگ
مغربی روشن خیالی ہے مکرّر تیرگی

کیا غضب ہے ظالموں کی پردہ داری کے لئے
صبح کو اُٹھتا ہے سورج ساتھ لے کر تیرگی

لڑ رہا ہوں میں اندھیرے میں اندھیرے کے خلاف
ایک دن مختارؔ ہارے گی بکھر کر تیرگی

غزل

یشب تمنا

اُٹھا رکھا تھا میں نے بارِ گریہ
مگر ہے سامنے دیوارِ گریہ

محبت میں محرم آچکا ہے
کوئی کیسے کرے انکارِ گریہ

بہت خود دار ہوں میں، جانتا ہوں
نہیں اُٹھے گا مجھ سے بارِ گریہ

وہیں پر تو غبارِ دل چھٹے گا
کبھی بیٹھو سرِ دربارِ گریہ

یشبؔ کل رات میں جی بھر کے رویا
اُٹھا ہوں آج میں سر شارِ گریہ

غزل

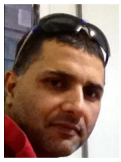

اطیب جاذل

مجھ سے اُونچا ترا قد ہے، حد ہے
پھر بھی سینے میں حسد ہے؟ حد ہے

میرے تو لفظ بھی کوڑی کے نہیں
تیرا نقطہ بھی سند ہے، حد ہے

عشق میری ہی تمنا تو نہیں
تیری نیت بھی تو بد ہے، حد ہے

زندگی کو ہے ضرورت میری
اور ضرورت بھی اشد ہے، حد ہے

بے تحاشہ ہیں ستارے لیکن
چاند بس اک عدد ہے، حد ہے

اشک آنکھوں سے یہ کہہ کر نکلا
یہ ترے ضبط کی حد ہے، حد ہے

روکتے کیوں نہیں اس کو جاذلؔ
یہ جو سانسوں کی رسد ہے، حد ہے

غزل

عذرا ناز

ساتھ دینے کا جس کا وعدہ تھا
آہ! وہ شخص کتنا سادہ تھا

نامکمل تھی میں اُس کے بن
وہ بھی میرے بغیر آدھا تھا

چل رہا تھا وہ جیسے رستے پر
اُس کی کچھ سمت تھی نہ جادہ تھا

جانے کیا ہم نے سوچ رکھا تھا
جانے کیا وقت کا ارادہ تھا

تیرا میرا اُسی جگہ ملنا
بیتے لمحوں کا ہی وعدہ تھا

وہ بلا کا خطیب تھا لیکن
چُپ کا اوڑھے ہوئے لبادہ تھا

وقت نے جو ستم کیا مجھ پر
وہ تصور سے بھی زیادہ تھا

وہ نہ لوٹا مگر کبھی عذراؔ
"لوٹ آنے کا جس کا وعدہ تھا

غزل

عبدالجلیل عباد جرمنی

دریچہ کھول کر دیکھا اُداس منظر تھا
پھر اپنے آپ میں جھانکا اُداس منظر تھا

سیاحت دیر تک کرتا رہا خیالوں کی
تمام سفر کا رستہ اُداس منظر تھا

جو ارد گرد دوڑائی نظر تو کیا دیکھا
ہر ایک سمت ہی پھیلا اُداس منظر تھا

مایوس ہو کر میں سوگیا زمیں پہ ہی
جو خواب دیکھا تو وہ بھی اُداس منظر تھا

نجانے کب تلک پھرتا رہا یونہی اُن میں
جو تھک کے بیٹھا تو دل کا اُداس منظر تھا
میں جس سے ملا اپنے جیسا ہے پایا
ہر ایک شخص کا چہرہ اُداس منظر تھا

غزل

اکرم ثاقب

دل سمندر تھا تو آنکھیں تھیں بیابان کوئی
ایسے رستے میں ملا جیسے ہو انجان کوئی
رات آئے تھے زمانے میری دہلیزوں پر
صبح کو چھوڑ گیا بے سرو سامان کوئی
میری وسعت ہے میری آنکھ تلک اس کے بعد
ایک ہجرت پہ لکھی ہے میری پہچان کوئی
لشکرِ شام ہے اور ہاتھ ہیں خالی میرے
دَشتِ تنہا میں کھلا دیدہ حیران کوئی
چاند نکلا بھی نہیں رات کے سناٹے میں
دل بہلنے کا بھی اب کے نہیں امکان کوئی
ڈھل گئے شام دریچوں سے پرے ثاقب جی
پھر سے اُبھرے گا میرے دل میں بیابان کوئی

غزل

احمد نواز

مت قتل کرو آوازوں کو
تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اُتارے جاتے ہو
ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو؟
اس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو
ہم پالنہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں
تم کس کا لہو پینے آئے ہو
ہم پیار سکھانے والے ہیں
اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا
جب تیغ پہ لے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا
جب قتل ہوا سُر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا
جب شہر کھنڈر بن جائے گا
پھر کس پہ سنگ اُٹھاؤ گے
اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

غزل

محمد اسحاق اطہر

فرشتہ ہوں نہ ہی شیطان ہوں میں
کہوں کیسے کہ اک انسان ہوں میں
خودی میں نفس کی بس مست سا ہوں
مرا کیا ہوگا بس انجان ہوں میں
بہت ہی زور بازو پر ہوں نازاں
حقیقت میں بہت نادان ہوں میں
بھری بستی میں بھی لگتا ہے ایسے
اکیلا اور پُر ہیجان ہوں میں
ہے فانی اک سرائے یہ جہاں بھی
کہ بس چند دن یہاں مہمان ہوں میں
میرے جینے کا ہے مدعا کیا
سمجھ آئے نہ کچھ حیران ہوں میں

غزل

شگفتہ شفیق

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
اپنی اُلفت کا رُخ بدلتا رہا
میری دیوانگی پے ہنستا رہا
اک زمانہ آوازیں کستا رہا
اسے ملتے جو پایا غیروں سے
دل میں چپکے سے اپنے کڑھتا رہا
کوئی مرہم نہیں ملا مجھ کو
زخم اندر ہی کوئی بڑھتا رہا
اپنے غم کو چھپا کے سینے میں
سرِ محفل ہمیشہ ہنستا رہا
جیسے دل مر گیا میرا جاناں
ساون آنکھوں سے یوں برستا رہا
اس کی خاطر لکھا کئے نظمیں
رات بھر یوں چراغ جلتا رہا

غزل

طاہر عدیم

اک عجب سی کشمکش کے ابتلا میں مبتلا
آج تک ہوں میں انا کی کربلا میں مبتلا
ذہنِ میزانِ سخن میں ابتدا سے غرق ہے
دل ازل سے ہے بیانِ بر ملا میں مبتلا
وہ وراء و ماوراء کے بھید سارے پا گئے
میں ابھی تک عاشقانِ مبتلا میں مبتلا
دل کہ ہفت افلاک کی سب وسعتوں کو پا گیا
عقل اب تک راز و اسرارِ خلا میں مبتلا
برسرِ پیکار ہے وہ بھی کسی آسیب سے
میں بھی طاہرؔ ہوں کسی ردِّ بلا میں مبتلا

غزل

طفیل عامر

دن ایک طرف، پل بھی گزارے نہیں جاتے
اب اور طرف، دھیان ہمارے نہیں جاتے
گر غور کریں درد سوا ہوتا ہے ان سے
پتھر کی جگہ پھول بھی مارے نہیں جاتے
ہے پیارا رہے وردِ زباں ذکر ہمیشہ
دے دے کے صدا نام پکارے نہیں جاتے
چل گھر سے نکل اور ستم دنیا کے سہہ کے
گھر بیٹھے مقدر تو سنوارے نہیں جاتے
اس دل سے بھلا یاد کبھی جائے گی کیسے
آنکھوں سے کبھی نقش تمہارے نہیں جاتے
جو بھول گئے ان کا تو کیا ذکر کریں ہم
ہیں یاد جو احسان اُتارے نہیں جاتے
خواہ کچھ بھی ہے تاریخ بتاتی ہے یہ عامرؔ
کہ ایک طرف لوگ یہ سارے نہیں جاتے

بی اے رفیق

طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا

نیک و مخلص خلیق تھا، نہ رہا
مہربان و شفیق تھا، نہ رہا
رازہائے درون و عرفاں کا
ایک بحرِ عمیق تھا، نہ رہا
واقفِ رموزِ حق بندگی
ایک دانا لئیق تھا، نہ رہا
خوش نصیبی نے جس کو گود لیا
ایک لعلِ عتیق تھا، نہ رہا
تھا بلند اور خاکساری میں
سرتاپا ہی غریق تھا، نہ رہا
سب کی خوشیوں پہ خوش تو غموں پہ دکھی
ایک قلبِ رقیق تھا، نہ رہا
طاعت و زہد اور شگفتہ پن
وہ، یہ جس کا طریق تھا، نہ رہا
چل رہا تھا جو اُس سے وابستہ
ایک عہدِ عتیق تھا، نہ رہا
ڈھونڈتی پھر رہی ہے کس کو نظر
وہ جو سب کا رفیق تھا، نہ رہا
آج کیسی خبر یہ دی ہاتف
بشیر احمد رفیق تھا، نہ رہا

غزل

طاہر بٹ

دل اٹکے، ہے وہ زلف کا خم بھی اسی لئے
بیٹھے ہوئے ہیں، آپ بھی، ہم بھی، اسی لئے
تا کہ مجاز میں بھی حقیقت دکھائی دے
نکلا بُتوں پہ ہے میرا دم بھی اسی لئے
یہ سلسلہ ہے عشق کا پھیلا ہے چار سُو
سجدے بھی ہیں، طوافِ حرم بھی اسی لئے
قطرہ بہ قطرہ رِستا ہے ہر آن خونِ دل
رہتی ہماری آنکھ ہے نم بھی اسی لئے
نشہ نہ ٹوٹ جائے کہیں اُسکی چاہ کا
مشقِ ستم بنے میاں ہم بھی اسی لئے
شعروسخن کے حیلے سے کرتے ہیں تجھ کو یاد
ہاتھوں میں ہے ہمارے قلم بھی اسی لئے
طاہرؔ وہ بے وفا سہی دل کا بُرا نہیں
میری خوشی بھی اس لئے غم بھی اسی لئے

غزل

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

مجھ کو وہ حسرتوں کی یوں تصویر کر گیا
چنری کو تپتی دھوپ کی جاگیر کر گیا
خواہش تو تھی کہ گل کی طرح سے کھلوں مگر
وہ زرد سی رتیں ہی بس تقدیر کر گیا
جیسے ہی میں دھلیز کے اس پار آ گئی
دیوار ہجر اک نئی تعمیر کر گیا
قصہ جنونِ عشق کا تم پوچھتے ہو کیوں
ہر ایک دکھ وہ باعثِ توقیر کر گیا
اس داستاں میں کونسا کردار ہے میرا
سوھنی ہوں، صاحباں ہوں کہ وہ ہیر کر گیا؟
مدت سے ایک چاک پہ ہے رقص میں حیات
وہ کوزہ گر کچھ اس طرح تسخیر کر گیا
جیون میں روشنی کی ضمانت بھی تھے وہی
اک دائمی سی رات جو تحریر کر گیا

غزل

حمیدہ معین رضوی

تھا لمحے بھر کا فیصلہ پچھتائی عمر بھر
لپٹی رہی ہوں درد کی چادر میں عمر بھر
ہم مات کھا چکے کہ سیاست کا گُر نہ تھا
اب پیٹتے لکیر رہیں چاہے عمر بھر
جانے کھلے کی آنکھ بھی سوچتی رہی
چلتی رہی ہوں خواب میں لگتا ہے عمر بھر
صحرا میں وقت کی یہ بھٹکتا ہوا بشر
جس کے ارادے ٹوٹتے رہتے ہیں عمر بھر
جاتے مروتیں تھیں کہ بزدلی تھی جو
کہہ پائے ہم نہ بات جو کہنی تھی عمر بھر

غزل

عبدالکریم قدسی

وفا کی رسم کو اک آن بان دیتے ہیں
جہادِ عشق میں ہم لوگ جان دیتے ہیں
ہمیں بھی چاہیئے اشکوں کی فصل پر قرضہ
زمینِ درد کا ہم بھی لگان دیتے ہیں
خیال و فکر سے، شعرو ادب کی دنیا کو
نئی زمین، نیا آسمان دیتے ہیں
پڑے کہیں نہ کڑی دھوپ دشمنِ جاں پر
ردائے جان کو دشمن پہ تان دیتے ہیں
اٹوٹ رشتہ ہمارا ہے ربِ کعبہ سے
یہاں نہیں تو وہاں پہ اذان دیتے ہیں
وہی ہیں گونگی فضاؤں کی رونق و خوشبو
جو حرف وصوت کو قدسیؔ زبان دیتے ہیں

غزل

سبینہ سحر

جہانِ خواب میں ایک راستہ بناتے ہوئے
میں کھو نہ جاؤں کہیں کچھ نیا بناتے ہوئے
بھڑکتی آگ میں بھی مسکرا کے چلتے رہے
ہم ایک دوسرے کو آسرا بناتے ہوئے
ہزار کوششوں سے کچھ نہیں ملا، لیکن
خود اپنی ذات ملی آئنہ بناتے ہوئے
میں خود ہی ڈوب گئی رات کے اندھیرے میں
تمہارا چہرہ کسی چاند سا بناتے ہوئے
ہوا سے جنگ لڑی ہے بہت دنوں میں نے
کسی کے جسم کی خاطر قبا بناتے ہوئے
جنونِ شوق کے رستے پہ ساتھ چلتے رہے
سحرؔ کے خواب کو ہم نقشِ پا بناتے ہوئے

غزل

حبیب جالبؔ

اب گناہ و ثواب بکتے ہیں
مان لیجے جناب بکتے ہیں
میری آنکھوں سے آکے لے جاؤ
ان دکانوں پہ خواب بکتے ہیں
پہلے پہلے غریب بکتے تھے
اب تو عزت مآب بکتے ہیں
بے ضمیروں کی راج نیتی ہے
جاہ و منصب خطاب بکتے ہیں
شیخ، واعظ، وزیر اور شاعر
سب یہاں پر جناب بکتے ہیں
دور تھا انقلاب آئے تھے
آج کل انقلاب بکتے ہیں
دل کی باتیں حبیبؔ جھوٹی ہیں
دل بھی خانہ خراب بکتے ہیں

غزل

عبیداللہ علیم

دل ہی تھے ہم دکھے ہوئے تم نے دکھا لیا تو کیا
تم بھی تو بے اماں ہوئے ہم کو ستا لیا تو کیا
آپ کے گھر میں ہر طرف منظرِ ماہ و آفتاب
ایک چراغِ شام اگر میں نے جلا لیا تو کیا
باغ کا باغ آپ کی دسترسِ ہوس میں ہے
ایک غریب نے اگر پھول اُٹھا لیا تو کیا
لُطف یہ ہے کہ آدمی عام کرے بہار کو
موجِ ہوائے رنگ میں آپ نہالیا تو کیا
اب کہیں بولتا نہیں غیب جو کھولتا نہیں
ایسا اگر کوئی خدا تم نے بنا لیا تو کیا
جو ہے خدا کا آدمی اُس کی ہے سلطنت الگ
ظلم نے ظلم سے اگر ہاتھ ملا لیا تو کیا
آج کی ہے جو کربلا کل پہ ہے اُس کا فیصلہ
آج ہی آپ نے اگر جشن منا لیا تو کیا
لوگ دکھے ہوئے تمام رنگ بجھے ہوئے تمام
ایسے میں اہلِ شام نے شہر سجا لیا تو کیا
پڑھتا نہیں ہے اب کوئی سنتا نہیں ہے اب کوئی
حرف جگا لیا تو کیا شعر سنا لیا تو کیا

غزل

مبارک صدیقی

تنکوں کا سائبان ہے، اوپر سے بارشیں
اک شہر بے امان ہے، اوپر سے بارشیں
ٹوٹے ہوئے ہیں پر مرے، صیاد سامنے
کھینچے ہوئے کمان ہے، اوپر سے بارشیں
مجھ بے امان شخص کا، کیا پوچھتے ہو حال
کچا مرا مکان ہے، اوپر سے بارشیں
اس بار ہجرتوں سے عجب فاصلے بڑھے
دریا بھی درمیان ہے، اوپر سے بارشیں
کچھ نورِ حُسنِ یار بھی ہے مثلِ آفتاب
کچھ دل بھی نوجوان ہے، اوپر سے بارشیں
کچھ شام بھی ہے شام سے ہی سوگوار سی
کچھ اُس کا بھی دھیان ہے، اوپر سے بارشیں
وہ دن گئے کہ عشق میں آتش جوان تھا
اب مستقل تھکان ہے، اوپر سے بارشیں

غزل

حبیب الرحمن ساحر امریکہ

ہم تو جس طرح بنے رسم نبھا ہی دیں گے
یہ الگ بات..ہمیں آپ سزا ہی دیں گے

ہم فقیروں کی تو عادت ہے تمہی کچھ کہو
گالیاں اور نہ دو ..ہم تو دعا ہی دیں گے
ساقیا، ہم سے نہ ہو یونہی پریشاں خاطر
آئینے ٹوٹنے والے، تو صدا ہی دیں گے
پرسشِ غم تو بہانہ ہے کہ ذکر تو ہو
بات پھر خیر سے احباب بڑھا ہی دیں گے
ہم نشیمانِ نفس، اتنے بھی مایوس نہ ہو
خار پھولوں کو بہرحال بچا ہی دیں گے
چوم لو نامۂ تعزیر کی سولی ساحرؔ
کچھ تو ہم عدل کی زنجیر ہلا ہی دیں گے

غزل

ہادی مونس کنیڈا

یوں تو دنیا میں کئی رب ہیں
ایک خدا کے لیکن سب ہیں
آوارہ۔سودائی،مجنوں
عشق نے پائے کتنے لقب ہیں
شکوہ شکایت کرنے والے
آپ میرے گھر آتے کب ہیں
مٹی کا بت رب عالم
آپ کی باتیں کتنی عجب ہیں
دل سوکھا جائے تب تب ہے
پھول کھلے دیکھے جب جب ہیں
بدعت پیدا کرنے والے
صحرا نشیں ہیں یا راہب ہیں
کہتے ہیں بت بالا فطرت
تو پھر یہ کیوں یہ مہر بلب ہیں
آنے والا وقت پہ آیا
مونس ٹوٹ گئے کوکب ہیں

بیادِ شہسورِ ملک عدم

بی اے رفیق
آدم چغتائی

خموشی لب پہ ترے موجۂ گفتار بن جائے
محبت کی کرن آئینہ افکار بن جائے
تمہی کہہ دو تمہارے چاہنے والے کہاں جائیں
جو مرگِ ناگہانی راہ کی دیوار بن جائے
بچھڑنا جسدِ خاکی کا بھی یک گونہ قیامت ہے
خصوصاً جب محبت یاد کا شہکار بن جائے
متاعِ زمزمۂ فکر میں آہوں کی ہے جھنکار
صبا کے دوش پر یہ خوشبوئے تا تار بن جائے
جبیں پر عاجزی، جو کہ، تفکّر سے تھی مالا مال
تیرا یہ عجز ترے صدق کا گلزار بن جائے
ترا ماضی تیری یادوں کا اک دل کش خزانہ ہے
دُعا آدمؔ کی تیرا نام دُرِ شہ بار بن جائے

غزل

رمضان شائق

کیوں نہ کیا عشق سے کنارا یہ قصہ پھر سہی
کیسے ہوا دل زخمی ہمارا یہ قصہ پھر سہی
موت کو گلے لگا کر ہم سُرخرو تو ہوگئے
میت کو دیا کس نے سہارا یہ قصہ پھر سہی
تیر برسانے کی کس کس نے سنبھالی کمان
کون غیر تھا اور کون ہمارا یہ قصہ پھر سہی
ستارے توڑ لانے کا وعدہ تھا کسی اور کا
یہ قرض کس نے اُتارا یہ قصہ پھر سہی
آزمائش کی لیئے تھا کون میدانِ عشق میں
کس نے دل نشانے پہ اُتارا یہ قصہ پھر سہی
شائق پہلے سہارا تو دیجیئے دلِ مغموم کو
کیوں نہ ملا کشتی کو کنارا یہ قصہ پھر سہی

صدق پر قربان

خان بشیر احمد رفیقؔ
ڈاکٹر منورؔ احمد کنڈے

اہلِ سخن کی شان تھے محترم رفیقؔ
شاعروں کی جان تھے، محترم رفیق
گفتگو میں بااثر تھے اس قدر
قلب کے سلطان تھے محترم رفیق
ان کی تصنیفات سے ظاہر ہے یہ
عاشقِ قرآن تھے محترم رفیق
فضل مسجد میں رہے تھے وہ امام
صدق پر قربان تھے محترم رفیق
ان کی دانش کے بہت ہیں معتقد
بندۂ رحمان تھے محترم رفیق
وہ بتاتے تھے دعا کے معجزات
صاحبِ ایمان تھے محترم رفیق
ہے خدا واحد، محمد ﷺ ہیں رسول
ان پہ ہی قربان تھے محترم رفیق
احمدیتؐ کے لئے وہ وقف تھے
ضیغمِ میدان تھے محترم رفیق
تھے بلاشک وہ خطابت میں مہان
لفظ کی پہچان تھے محترم رفیق
وہ مبلغ صدق کے اور خادمِ اسلام
اس طرح ذیشان تھے محترم رفیق
تھے منورؔ وہ محبت کے سفیر
صاحبِ عرفان تھے محترم رفیق
کر عطا فردوس میں گھر اے خدا
اور شفاعت ہو محمد ﷺ کی عطا
ان کے پیاروں کو ملے صبرِ جمیل
حوصلے اونچے ہوں اور عمرِ طویل

حضرت قائداعظمؒ چوہدری ظفراللہ خان کی لیاقت کے قدردان اوران کی قومی خدمات کے مداح تھے

رانا عبدالرزاق
خاں لندن

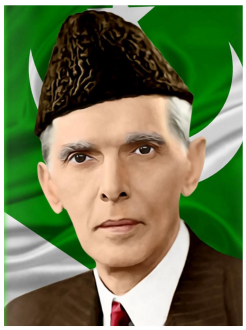

برصغیر ہندو پاک کی تحریک آزادی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک آزادی کے عظیم اور سرگرم لیڈر محمد علی جناح (جو ابھی قائد اعظم کے قابل صد احترام لقب سے معروف نہیں ہوئے تھے) برصغیر ہندو پاک کے چیدہ چیدہ و معروف و مخلص لیڈروں سے خوب شناسا تھے اور ان عمائدین میں چوہدری ظفراللہ خان خوب نمایاں اور فعال تھے۔

ہندوستان میں آئینی اصلاحات اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جو مساعی کی گئیں۔لندن میں منعقدہ ''تین گولمیز کانفرنسیں'' (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء) اس سلسلہ کی تین اہم کڑیاں تھیں۔جن میں انڈیا کے چوٹی کے لیڈر شامل ہوئے۔اور حکومت برطانیہ کے ساتھ گفت وشنید میں حصہ لیا۔جس کے نتیجہ میں کئی اصلاحات تشکیل پا گئیں۔چوہدری سر ظفر اللہ خان کو ان تینوں کانفرنسوں میں بھرپور عملی شرکت کا موقع ملا۔لہٰذا قائد اعظم جیسے زیرک لیڈر چوہدری سر ظفراللہ خان کی نمایاں سرگرمیوں سے خوب آگاہ تھے۔مؤرخ پاکستان ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب ''اقبال کے آخری دو سال'' میں واضح طور پر تحریر کیا۔''گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین میں سے سب سے زیادہ کامیاب آغا خاں (وفد کے سربراہ) اور چوہدری ظفراللہ خان ثابت ہوئے۔''

(اقبال کے آخری دو سال ص ۱۶ ناشر اکیڈمی کراچی)

ہندوستان کی مرکزی اسمبلی (۱۹۳۹) میں قائد اعظمؒ کا ایک بیان۔غیر منقسم ہندوستان میں بھی چوہدری صاحب کی ملک وملت کے لئے کامیاب سرگرمیوں کے پیش نظر قائداعظم نے چوہدری صاحب کو غیر معمولی خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''میں اپنی اور اپنی پارٹی کی طرف سے آنریبل سر چوہدری ظفر اللہ خان کو ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں۔وہ مسلمان ہیں اور یوں کہنا

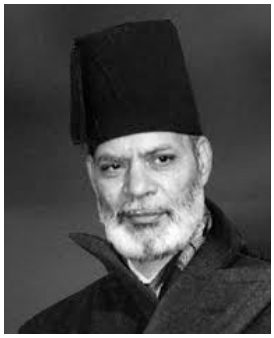

چاہیئے کہ میں اپنے بیٹے کی تعریف کر رہا ہوں۔مختلف حلقوں نے ان کو جو مبارکباد پیش کی ہے۔میں اس کی تائید کرتا ہوں''۔

(ہماری قومی جدوجہد ص ۸۷ مؤرخ پاکستان ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی پاکستان پریس لاہور)

پاکستان کے باقاعدہ معرض وجود میں آنے سے پہلے ''3/جون 1947ء کے ہند پلان'' کے جلد بعد انگریزی حکومت نے صوبہ پنجاب میں مسلم اکثریت کے باوجود اسے تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا اور باؤنڈری کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔اس موقع پر قائد اعظم نے مملکت خداداد پاکستان کے باقاعدہ قیام سے پہلے ہندوستان بھر کے وکلاء اور ماہرین قانون میں سے خود سر چوہدری ظفر اللہ خان کا انتخاب فرمایا کہ وہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے کیس کی وکالت کریں۔یہ قائداعظم کا چوہدری صاحب کی غیر معمولی لیاقت اور مخلصانہ جذبہ خدمت پر اعتماد کا زبردست ثبوت ہے۔ادھر چوہدری ظفراللہ خان کو بھی قائداعظم کا کس قدر احترام اور ان کے ارشاد کا کس قدر پاس تھا۔اس کا ثبوت چوہدری صاحب کے ان الفاظ سے عیاں ہے۔آپ جید صحافی منیر احمد منیر کے ساتھ اپنے انٹرویو میں بیان کرتے ہیں۔''قائداعظم نے مجھے بھوپال سے بلا کر ارشاد فرمایا کہ پنجاب باؤنڈری کمیشن میں آپ ہمارا کیس پیش کریں۔میں نے ان سے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں''۔

(انٹرویو مطبوعہ آتش فشاں مئی ۱۹۸۱ ص ۲۳ کالم نمبر ۱)

قائداعظمؒ مردم شناس تھے۔تحریک پاکستان کے ایک سرگرم رکن اور سابق سفیر و وزیر سید احمد سعید کرمانی قومی ڈائجسٹ کو بیان دیتے ہوئے فرمایا۔قائداعظم نے رائٹ مین فار رائٹ جاب چنا۔ظفراللہ خاں کی چائس بھی قائداعظمؒ کی تھی۔ظفراللہ خاں قیام پاکستان کے موقع

پرنواب آف بھوپال کے آئینی مشیر تھے۔قائداعظمؒ نے بلایا کہ آپ باؤنڈری کمیشن کے آگے مسلم لیگ آرگو کریں۔وہاں کی اچھی خاصی تنخواہ اورمراعات چھوڑ کر آگئے۔مطلب یہ ہے کہ قائداعظمؒ کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی دی تھی۔ (انٹرویو مطبوعہ قومی ڈائجسٹ اگست ۲۰۰۲ء ص ۲۶۔۲۷)

باؤنڈری کمیشن کے سامنے وکالت اور قائداعظمؒ کی پذیرائی۔اس سلسلہ میں وطن عزیز کے معروف صحافی منیر احمد منیر اپنے کالم مطبوعہ روزنامہ ''خبریں'' 7رجون 2003ء میں تحریر کرتے ہیں۔

قائداعظم نے چوہدری ظفراللہ خاں کو پنجاب باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے کے لئے مقرر کیا تھا اور جب چوہدری ظفراللہ خان یہ کیس پیش کر چکے۔قائداعظمؒ نے انہیں شام کے کھانے کی دعوت دی۔اورانہیں معانقہ کا شرف بخشا۔جو قائداعظمؒ کی طرف سے کرۂ ارض پر بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔معانقہ کرنے کے بعد قائداعظمؒ نے چوہدری سر ظفراللہ خاں سے کہا۔میں تم سے بہت خوش ہوں اور تمہارا ممنون ہوں کہ جو کام تمہارے سپرد کیا گیا تھا تم نے اسے اعلیٰ قابلیت اور نہایت احسن طریقے سے سرانجام دیا۔

(از کالم مطبوعہ روزنامہ خبریں مورخہ ۷رجون ۲۰۰۳)

اقوام متحدہ میں دو قابل ذکر کارنامے

اللہ تعالیٰ کے فضل سے قائداعظمؒ کی زیر قیادت طویل جدوجہد کے بعد مملکت خداداد پاکستان کا قیام 14راگست 1947ء کو عمل میں آیا۔اس لئے چوہدری صاحب کے لئے ایک اہم فریضہ پاکستان کے لئے اقوام متحدہ کی ممبرشپ حاصل کرنا تھی۔اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ مرحلہ عمدگی سے مکمل ہوگیا۔اقوام متحدہ میں دوسرا اہم کام مسئلہ فلسطین پر پاکستان کا موقف واضح کرنا اور عربوں کی بھرپور حمایت کرنا تھا۔اس سلسلہ میں چوہدری صاحب نے قائداعظمؒ اور حکومت پاکستان کی طے شدہ خارجہ پالیسی کے تحت فلسطینیوں اور بعد میں آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے مختلف عرب اور افریقی ممالک کے حق میں اقوام متحدہ کے فورم پر زبردست اور مؤثر آواز اٹھائی اور پاکستان کا نام دنیا بھر میں روشن کیا۔چنانچہ قائداعظمؒ کے ایک معتمد ساتھی اور پاکستان کے سابق وزیراعظم چوہدری محمد علی اپنی انگریزی کتاب ''ظہور پاکستان'' کے صفحہ 380 پر تحریر کرتے ہیں۔

مسلم دنیا کی آزادی،قوت،خوشحالی اور اتحاد کے لئے زبردست جدوجہد پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک مستقل مقصد رہا ہے۔حکومت پاکستان کا ایک اولین اقدام یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں ایک خیر سگالی وفد بھجوایا گیا۔پاکستان نے فلسطین میں عربوں کے حقوق کو اپنا مقصد قرار دیا۔اور اقوام متحدہ میں اس نصب العین کی خاطر پاکستان کے وزیرخارجہ سرظفراللہ خان سے بڑھ کر کوئی فصیح ترجمان نہیں تھا۔پاکستان اسرائیل کو نہ تسلیم کرنے کی پالیسی پر مسلسل گامزن ہے۔انڈونیشیا،ملایا، سوڈان،لیبیا،تیونس،مراکش،نائیجیریا،اور الجیریا کی آزادی کی خاطر پوری تگ ودو کی گئی۔''

(Emergence of Pakistan Page76 Edition 1976)

قائداعظمؒ کا نادر خراج عقیدت۔اقوام متحدہ میں چوہدری سر ظفراللہ خان اپنی خداداد تقریری فصاحت وبلاغت کے ذریعہ اقوام عالم کے سامنے نوزائدہ مملکت خداداد پاکستان کا مسئلہ لے جانے اور عالم اسلام خاص طور پر اہل فلسطین کے حق میں لاجواب وکالت وترجمانی میں مصروف تھے کہ امریکہ میں پاکستانی سفیر کے سلسلہ میں چوہدری صاحب کو واپس (اقوام متحدہ کا سیشن بیچ میں چھوڑ کر) وطن بلایا جارہا ہے۔ چنانچہ سفیر اصفہانی صاحب نے قائداعظمؒ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔جس میں چوہدری ظفراللہ خاں کی اقوام متحدہ میں سرگرمیوں کی اہمیت اور مصروفیات کا ذکر کیا۔اس خط کے جواب میں مورخہ 22 اکتوبر 1947ء کو قائداعظمؒ نے سفیر اصفہانی کو تحریر فرمایا۔

''جہاں تک ظفراللہ کا تعلق ہے تو ہم نہیں چاہتے کہ جب تک وہاں پر (اقوام متحدہ) ان کا قیام ضروری ہے وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس آجائیں۔اور میرا خیال ہے کہ انہیں اس امر کی اطلاع بھی دی جا چکی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں قابل لوگ خاص طور پر ان جیسی اعلیٰ صلاحیت کے اشخاص کی بہت کمی ہے۔اس لئے جب بھی مختلف مسائل سے واسطہ پڑتا ہے تو ان کے حل کے لئے لامحالہ ہماری نظریں ان کی طرف اٹھتی ہیں۔دستخط ایم اے جناح''۔

(ترجمہ اقتباس از مکتوب قائداعظم ص ۱۶۶۔ایڈیشن ۲۰۰۱)

واقعی انہوں نے اپنا کام بہت عمدگی سے سرانجام دیا ہے۔چوہدری سرظفر اللہ خاں رئیس الوفد برائے اقوام متحدہ جب 1947ء کے آخر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد جب واپس پہنچے۔جو ایم اے حسن اصفہانی کے مفصل مکتوب کے جواب میں 11ر دسمبر 1947ء کے مکتوب میں تحریر فرمایا۔" ظفر اللہ (نیویارک) سے واپس پہنچ گئے ہیں اور میری ان سے طویل گفتگو ہوئی ہے۔واقعی انہوں نے اپنا کام بہت عمدگی سے سرانجام دیا ہے"۔

(قائداعظم محمد علی جناح پیپرز جلد یکم اکتوبر تا ۳۱ر دسمبر ۷ ۱۹۴)

ایک کے بعد ایک اہم ذمہ داری۔قائداعظم محمد علی جناح کی طرف سے چوہدری ظفر اللہ خاں کو باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے کیس کی وکالت اور پھر قیام پاکستان کے فوراً بعد اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کا ذکر ہو چکا ہے۔متذکرہ بالا دونوں مواقع پر چوہدری سر ظفر اللہ خاں کی قابلیت اور کامیابی کے خوب جوہر کھلے۔اور پھر دسمبر ۷ ۱۹۴ء میں قائداعظم نے چوہدری سرظفر اللہ خاں کو وطن عزیز کے وزیر خارجہ کا منصب سنبھالنے کا ارشاد فرمایا۔گویا چوہدری صاحب کی لیاقت اور بے لوث خدمت پر قائداعظمؒ کا اعتماد بڑھتا گیا اور آپ انہیں ایک کے بعد ایک اہم تر اور وقیع تر ذمہ داری اور منصب سونپتے گئے۔

چوہدری سرظفر اللہ خاں مدیر" آتش فشاں" کے ساتھ انٹرویو میں بیان فرماتے ہیں۔

"قائداعظمؒ اور میرے درمیان نہ تو کبھی غلط فہمی پیدا ہوئی نہ اختلاف"۔

(انٹرویو مطبوعہ آتش فشاں مئی ۱۹۸۱)

اچھا انتخاب

سابق سفیر اور سابق وزیر سید احمد سعید کرمانی بیان کرتے ہیں۔

"بانی پاکستان کے ساتھ مخلص اور معتمد ساتھی راہنماؤں، دانشوروں، وکلاء، صحافیوں اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے متعلق افراد کی شاندار ٹیم جمع ہو گئی تھی۔قائد کو ان لوگوں کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا تھا۔وہ جانتے تھے کہ کس آدمی سے کیا کام لینا ہے۔پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان بھی قائد کا ایک اچھا انتخاب تھے"۔

(ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور اکتوبر 1999ء ص ۱۷ کالم نمبر ۲)

عمدہ رائے

قائداعظمؒ کے سابق اے ڈی سی (بعد میں پاک افواج کے سربراہ جنرل) گل حسن اپنے مشاہدہ کی بناء پر یہ گواہی دیتے ہیں۔" قائداعظمؒ اپنی کابینہ کے وزراء میں سر محمد ظفر اللہ خان اور سردار عبدالرب نشتر کے متعلق بہت عمدہ رائے رکھتے تھے"۔

(از مضمون مطبوعہ نوائے وقت سنڈے میگزین مورخہ ۵ر جون ۲۰۰۵ء ص ۱۰ کالم نمبر ۵)

چوہدری سرظفر اللہ خان کی قابلیت کا اعتراف

چوہدری صاحب کی قابلیت اور مہارت کو دیکھتے ہوئے قائداعظم نے آپ کو ۲۵ر دسمبر ۷ ۱۹۴ء کو پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ بنایا۔سول اینڈ ملٹری گزٹ نے قائداعظم کے حوالے سے لکھا:

"یہ ایک کھلا راز ہے کہ ظفر اللہ خاں نے اس عہدہ (وزارت خارجہ) کو قبول کرنے میں بڑی ہچکچاہٹ ظاہر کی۔قائداعظم کی پیشکش کے جواب میں آپ نے کہا کہ اگر آپ کو میری قابلیت اور دیانت پر پورا اعتماد ہے تو میں وزارت کے علاوہ کسی اور صورت میں پاکستان کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔اس پر قائداعظم نے یہ تاریخی جواب دیا۔'

"آپ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مجھ سے ایسے جذبات کا اظہار کیا ہے۔مجھے پتہ ہے آپ عہدوں کے بھوکے نہیں ہیں"۔قائداعظم کا یہ جواب چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان کی قابلیت اور راستبازی کا ایک روشن ثبوت ہے۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۱۲ر اگست ۱۹۵۲ء)

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان کے متعلق قائداعظم اکثر فرمایا کرتے تھے۔

" ظفر اللہ کا دماغ خداوند کریم کا زبردست انعام ہے۔ظفر اللہ پاکستان کے ایک گوہر نایاب ہیں"۔

(ہفت روزہ مسلم آواز کراچی ۱۵ر جون ۱۹۵۲ء)

قائداعظمؒ کا اعتماد اُن پر آخری دم تک قائم رہا۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ کے وہ خوش قسمت اور معتمد ساتھی تھے۔جن کو قائداعظمؒ کی جانب سے ہمیشہ خوشنودی اور اعتماد حاصل رہا۔اس کا ایک بہت بڑا ثبوت قائداعظمؒ کے سیکرٹری مسٹر فرخ امین کے اس بیان میں ملتا ہے۔جو منظور حسین عباسی کی

کتاب ''زندہ قائداعظمؒ'' کے ص ۳۴ پر مرقوم ہے:

''بیماری کے پورے زمانے میں قائداعظم نے اس وقت تک سرکاری کاموں کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی تھی... مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب انہوں نے یو این او میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان کو پورے اختیار دینے کے لئے آخری سرکاری کاغذ پر دستخط کئے...''

(زندہ قائداعظمؒ ص ۳۴ شائع کردہ مکتبہ شاہکار، چوک اردو بازار لاہور)

روشنی اور عزم کے مینار۔ مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر جہاں اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان کو بانی پاکستان بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ تادم آخر اپنا معتمد ساتھی قرار دیتے رہے۔ اور انہیں مملکت خداداد پاکستان کی عالمی سطح پر اعلیٰ سے اعلیٰ خدمات سونپتے رہے۔ وہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قائداعظمؒ اور ان کے متعدد جاں نثار و بے لوث ساتھی کسی طرح وطن عزیز کے لئے رات دن محنت اور استقلال وایثار سے کام لیتے تھے تاکہ ملک وملت شروع کے نامساعد حالات کے باوجود سلامتی، خودداری، اور ترقی پر گامزن رہے۔ بے شک یہ برگزیدہ اور جہاں دیدہ ہستیاں تھیں۔ ایسی عظیم اور عزیز ہستیاں۔

جن کی یادوں سے رگ جاں میں دکھن ہونے لگے
ذکر چھڑ جائے تو پتھر کا بھی دل رونے لگے

متقی امیر ومنصف۔ بلال افتخار

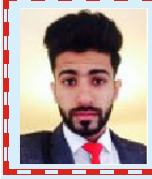

تمام وزیر میدان میں تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ سلطان غیاث الدین بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ اچانک سلطان کا نشانہ خطا ہوگیا اور وہ تیر ایک بیوہ عورت کے بچے کو جا لگا۔ اس سے وہ مر گیا۔ سلطان کو پتہ نہ چل سکا۔ وہ عورت قاضی سلطان کی عدالت میں پہنچ گئی۔ قاضی سراج الدین عورت کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: ''کیا بات ہے؟ تم کیوں رو رہی ہو؟'' عورت نے روتے ہوئے سلطان کے خلاف شکایت لکھوائی'' سلطان کے تیر سے میرا بچہ ہلاک ہوگیا ہے۔

قاضی سراج الدین نے عورت کی بات پوری توجہ سے سنی اور پھر اسی وقت سلطان کے نام خط لکھا: ''آپ کے خلاف شکایت آئی ہے۔ فوراً عدالت میں حاضر ہو جائیں اور اپنے خلاف آنے والی شکایت کا جواب دیں۔'' پھر یہ حکم عدالت کے ایک پیادے کو دے کر ہدایت کی: ''یہ حکم نامہ فوراً سلطان کے پاس لے جاؤ'' پیادے کو یہ حکم دے کر قاضی سراج الدین نے ایک گوڑا نکالا اور اپنی گدی کے نیچے چھپا دیا۔ پیادہ جب سلطان کے محل میں پہنچا تو اس دیکھا کہ سلطان کو درباریوں نے گھیر رکھا ہے اور قاضی کا حکم نامی سلطان تک پہنچانا مشکل ہے۔ یہ دیکھ کر پیادہ نے اُونچی آواز میں اذان دینا شروع کر دی۔ بے وقت اذان سن کر سلطان نے حکم دیا: ''اذان دینے والے کو میرے سامنے پیش کرو۔'' پیادے کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے گرج کر پوچھا: ''بے وقت اذان کیوں دے رہے تھے۔'' قاضی سراج الدین نے آپ کو عدالت میں طلب کیا ہے آپ فوراً میرے ساتھ عدالت چلیں۔'' پیادے نے قاضی صاحب کا حکم نامہ سلطان کو دیتے ہوئے کہا۔ سلطان فوراً اُٹھا۔ ایک چھوٹی سی تلوار اپنی آستین میں چھپالی۔ پھر پیادے کے ساتھ عدالت پہنچا۔ قاضی صاحب نے بیٹھے بیٹھے مقتول کی ماں اور سلطان کے بیان باری باری سنے پھر فیصلہ سنایا:

''غلطی سے ہوجانے والے قتل کی وجہ سے سلطان پر کفارہ اور اس کی برادری پر خون کی دیت آئے گی۔ ہاں اگر مقتول کی ماں مال کی کچھ مقدار پر راضی ہو جائے تو اس مال کے بدلے سلطان کو چھوڑا جا سکتا ہے''۔ سلطان نے لڑکے کی ماں کو بہت سے مال پر راضی کر لیا پھر قاضی سے کہا: ''میں نے لڑکے کی ماں کو مال پر راضی کر لیا ہے۔'' قاضی نے عورت سے پوچھا: ''کیا آپ راضی ہو گئیں۔'' ''جی ہاں میں راضی ہوگئی ہوں۔ عورت نے قاضی کو جواب دیا۔ اب قاضی اپنی جگہ سے سلطان کی تعظیم کے لئے اٹھے اور انھیں اپنی جگہ پر بٹھایا۔ سلطان نے بغل سے تلوار نکال کر قاضی سراج الدین کو دکھاتے ہوئے کہا: ''اگر آپ میری ذرا سی بھی رعایت کرتے تو میں اس تلوار سے آپ کی گردن اُڑا دیتا۔'' قاضی نے بھی اپنی گدی کے نیچے سے گوڑا نکال کر سلطان غیاث الدین کو دکھاتے ہوئے کہا: ''اور اگر آپ شریعت کا حکم ماننے سے ذرا بھی ہچکچاتے تو میں اس گوڑے سے آپ کی خبر لیتا۔ بیشک یہ ہم دونوں کا امتحان تھا۔'' ایسے بھی حکمران تھے اور ایسے عادل منصفین تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ایسے عادل جج اور نیک حکمران عطا فرمائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

اقبال احمد نجم

ہم نے بچپن میں پڑھا تھا مقدونیہ کا الیگزینڈر 20 سال کی عمر میں بادشاہ بنا۔ 23 سال کی عمر میں مقدونیہ سے نکلا، اس نے سب سے پہلے پورا یونان فتح کیا، اس کے بعد وہ ترکی میں داخل ہوا، پھر ایران کے دارا شکوہ شکست دی، پھر وہ شام پہنچا، پھر اس نے یروشلم اور بابل کا رُخ کیا، پھر وہ مصر پہنچا، پھر وہ ہندوستان آیا، ہندوستان میں اس نے پورس سے جنگ لڑی، اپنے عزیز از جان گھوڑے کی یاد میں پھالیہ شہر آباد کیا، مکران سے ہوتا ہوا واپسی کا سفر شروع کیا، راستے میں ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوا اور 323 قبل مسیح میں 33 سال کی عمر میں بخت نصر کے محل میں انتقال کر گیا، دنیا کو آج تک بتایا گیا، وہ انسانی تاریخ کا عظیم جرنیل، فاتح اور بادشاہ تھا اور تاریخ نے اس کے کارناموں کی وجہ سے اسے الیگزینڈر دی گریٹ کا نام دیا اور ہم نے اسے سکندر اعظم یعنی بادشاہوں کا بادشاہ بنا دیا، لیکن آج اکیسویں صدی کے نویں سال کے پہلے دن میں پوری دنیا کے مورخین کے سامنے یہ سوال رکھتا ہوں کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے الیگزینڈر کو سکندر اعظم کہلانے کا حق حاصل ہے؟ میں دنیا بھر کے مورّخین کو سکندر اعظم اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فتوحات اور کارناموں کے موازنے کی دعوت دیتا ہوں، آپ بھی سوچئے الیگزینڈر بادشاہ کا بیٹا تھا، اسے دنیا کے بہترین لوگوں نے گھڑسواری سکھائی، اسے ارسطو جیسے استادوں کی صحبت ملی تھی اور جب وہ بیس سال کا ہو گیا تو اسے تخت اور تاج پیش کر دیا گیا، جب کہ اس کے مقابلے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی 7 پشتوں میں کوئی بادشاہ نہیں گزرا تھا، آپ بھیڑ بکریاں اور اُونٹ چراتے چراتے بڑے ہوئے تھے اور آپ نے تلوار زنی اور تیر اندازی بھی کسی اکیڈمی سے نہیں سیکھی تھی۔

سکندر اعظم نے آرگنائزڈ آرمی کے ساتھ 10 برسوں میں 17 لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا تھا، جب کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے 10 برسوں میں آرگنائزڈ آرمی کے بغیر 22 لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا اور اس میں روم اور ایران کی دو سپر پاور بھی شامل تھیں۔ آج کے سیٹلائٹ، میزائل اور آبدوزوں کے دور میں بھی دنیا کے کسی حکمران کے پاس اتنی بڑی سلطنت نہیں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نہ صرف گھوڑوں کی پیٹھ پر فتح کرائی تھی، بلکہ اس کا انتظام و انصرام بھی چلایا تھا، الیگزینڈر نے فتوحات کے دوران اپنے بے شمار جرنیل قتل کرائے، بے شمار جرنیلوں اور جوانوں نے اس کا ساتھ چھوڑا، اس کے خلاف بغاوتیں بھی ہوئیں اور ہندوستان میں اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار بھی کر دیا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کسی ساتھی کو ان کے حکم سے سرتابی کی جرات نہ ہوئی، وہ ایسے کمانڈر تھے کہ آپ نے عین میدان جنگ میں عالم اسلام کے سب سے بڑے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا اور کسی کو یہ حکم ٹالنے کی جرات نہ ہوئی۔

آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کوفے کی گورنری سے ہٹا دیا۔ آپ نے حضرت حارث بن کعب رضی اللہ عنہ سے گورنری واپس لے لی۔ آپ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا مال ضبط کر لیا اور آپ نے حمص کے گورنر کو واپس بلا کر اُونٹ چرانے پر لگا دیا، لیکن کسی کو حکم عدولی کی جرائت نہ ہوئی۔ الیگزینڈر نے 17 لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا، لیکن دنیا کو کوئی نظام، کوئی سسٹم نہ دے سکا، جب کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دنیا کو ایسے سسٹم دیئے جو آج تک پوری دنیا میں رائج ہیں، آپ نے نماز فجر میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کرایا۔ آپ کے عہد میں نماز تراویح کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ آپ نے شراب نوشی کی سزا مقرر کی۔ سن ہجری کا اجرا کیا۔ جیل کا تصور دیا۔ موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں، مسجدوں میں روشنی کا بندوبست کرایا۔ پولیس کا محکمہ بنایا۔ ایک مکمل عدالتی نظام کی بنیاد رکھی۔ آب پاشی کا نظام قائم کرایا۔ فوجی چھاؤنیاں بنوائیں اور فوج کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا۔ آپ نے دنیا میں پہلی بار دودھ پیتے بچوں، معذوروں، بیواؤں اور بے آسراؤں کے وظائف مقرر کیے۔ آپ نے دنیا میں پہلی بار حکمرانوں، سرکاری عہدیداروں اور والیوں کے اثاثے ڈکلیئر کرنے کا تصور دیا۔ آپ نے بے انصافی کرنے والے ججوں کو سزا دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا اور آپ نے دنیا میں پہلی بار حکمران کلاس کی اکاؤنٹبلٹی شروع کی۔ آپ راتوں کو تجارتی قافلوں

کی چوکیداری کرتے تھے۔

آپ فرمایا کرتے تھے جو حکمران عدل کرتے ہیں، وہ راتوں کو بے خوف سوتے ہیں۔آپ کا فرمان تھا ''قوم کا سردار قوم کا سچا خادم ہوتا ہے۔'' آپ کی مہر پر لکھا تھا ''عمر! نصیحت کے لیے موت ہی کافی ہے''۔آپ کے دسترخوان پر کبھی دو سالن نہیں رکھے گئے۔آپ زمین پر سر کے نیچے اینٹ رکھ کر سو جاتے تھے۔آپ سفر کے دوران جہاں نیند آجاتی تھی، آپ کسی درخت پر چادر تان کر سایہ کرتے تھے اور سو جاتے تھے اور رات کو ننگی زمین پر دراز ہو جاتے تھے۔آپ کے کرتے پر 14 پیوند تھے اور ان پیوندوں میں ایک سرخ چمڑے کا پیوند بھی تھا۔آپ موٹا کھردرا کپڑا پہنتے تھے۔آپ کو نرم اور باریک کپڑے سے نفرت تھی۔آپ کسی کو جب سرکاری عہدے پر فائز کرتے تھے تو اس کے اثاثوں کا تخمینہ لگوا کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور اگر سرکاری عہدے کے دوران اس کے اثاثوں میں اضافہ ہو جاتا تو آپ اس کی اکاؤنٹبلٹی کرتے تھے۔آپ جب کسی کو گورنر بناتے تو اسے نصیحت فرماتے تھے۔کبھی ترکی گھوڑے پر نہ بیٹھنا، باریک کپڑے نہ پہننا، چھنا ہوا آٹا نہ کھانا، دربان نہ رکھنا اور کسی فریادی پر دروازہ بند نہ کرنا۔آپ فرماتے تھے ظالم کو معاف کر دینا مظلوموں پر ظلم ہے اور آپ کا یہ فقرہ آج انسانی حقوق کے چارٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔''مائیں بچوں کو آزاد پیدا کرتی ہیں، تم نے انہیں کب سے غلام بنالیا'' فرمایا میں اکثر سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔''عمر بدل کیسے گیا۔''

آپ اسلامی دنیا کے پہلے خلیفہ تھے، جنہیں ''امیر المومنین'' کا خطاب دیا گیا۔دنیا کے تمام مذاہب کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہے، اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت عدل ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہ شخصیت ہیں جو اس خصوصیت پر پورا اُترتے ہیں۔آپ کے عدل کی وجہ سے عدل دنیا میں عدلِ فاروقی ہو گیا۔آپ شہادت کے وقت مقروض تھے، چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کا واحد مکان بیچ کر آپ کا قرض ادا کر دیا گیا اور آپ دنیا کے واحد حکمران تھے جو فرمایا کرتے تھے میرے دور میں اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی سزا عمر (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کو بھگتنا ہوگی۔

آپ کے عدل کی یہ حالت تھی۔آپ کا انتقال ہوا تو آپ کی سلطنت کے دور دراز علاقے کا ایک چرواہا بھاگتا ہوا آیا اور چیخ کر بولا ''لوگو! حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔'' لوگوں نے حیرت سے پوچھا ''تم مدینہ سے ہزاروں میل دور جنگل میں ہو تمہیں اس سانحے کی اطلاع کس نے دی۔'' چرواہا بولا ''جب تک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ زندہ تھے، میری بھیڑیں جنگل میں بے خوف پھرتی تھیں اور کوئی درندہ ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا، لیکن آج پہلی بار ایک بھیڑیا میری بھیڑ کا بچہ اُٹھا کر لے گیا۔

میں نے بھیڑیے کی جرأت سے جان لیا کہ آج دنیا میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود نہیں ہیں۔'' میں دنیا بھر کے مورّخین کو دعوت دیتا ہوں، وہ الیگزینڈر کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھ کر دیکھیں انہیں الیگزینڈر حضرت عمر فاروق کے حضور پہاڑ کے سامنے کنکر دکھائی دے گا، کیونکہ الیگزینڈر کی بنائی سلطنت اس کی وفات کے 5 سال بعد ختم ہو گئی، جب کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں جس جس خطے میں اسلام کا جھنڈا لہرایا، وہاں سے آج بھی اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں آتی ہیں، وہاں آج بھی لوگ اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔دنیا میں الیگزینڈر کا نام صرف کتابوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے، جب کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بنائے نظام دنیا کے 245 ممالک میں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

آج بھی جب کسی ڈاک خانے سے کوئی خط نکلتا ہے، پولیس کا کوئی سپاہی وردی پہنتا ہے، کوئی فوجی جوان 6 ماہ بعد چھٹی پر جاتا ہے یا پھر حکومت کسی بچے، معذور، بیوہ یا بے آسرا شخص کو وظیفہ دیتی ہے تو وہ معاشرہ، وہ سوسائٹی، بے اختیار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو عظیم تسلیم کرتی ہے، وہ انہیں تاریخ کا سب سے بڑا سکندر مان لیتی ہے، ماسوائے ان مسلمانوں کے جو آج احساس کمتری کے شدید احساس میں کلمہ تک پڑھنے سے پہلے دائیں بائیں دیکھتے ہیں۔لاہور کے مسلمانوں نے ایک بار انگریز سرکار کو دھمکی دی تھی ''اگر ہم گھروں سے نکل پڑے تو تمہیں چنگیز خان یاد آجائے گا۔'' اس پر جواہر لال نہرو نے مسکرا کر کہا تھا ''افسوس آج چنگیز خان کی دھمکی دینے والے مسلمان یہ بھول گئے، ان کی تاریخ میں ایک (حضرت) عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) بھی تھا۔'' ہم آج بھی یہ بھولے ہوئے ہیں کہ ہم میں ایک حضرت عمر فاروق بھی تھے، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ حضرت عمر بن خطاب ہوتے۔(ماخوذ)

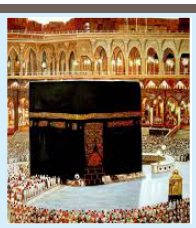

علماء دیوبند کی وہ کون سی گستاخیاں تھی جن کی وجہ سے ان پر سیدی اعلیٰ حضرت اور 33 علماء حرمین نے کفر کا فتوی دیا تھا

الجواب:وہ کفریہ عقائد جن کی بنا پر ان چاروں علماء دیوبند اور ان کے کفر پر شک کرنے والوں پر کفر کا فتوی دیا گیا تھا۔

(1) رشید احمد گنگوہی نے اپنی کتاب فتاویٰ رشیدیہ میں لکھا۔اللہ تعالی جھوٹ بول سکتا ہے۔ (فتاوی رشیدیہ پارٹ (1) پیج نمبر (20) معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

(2) اشرفعلی تھانوی نے اپنی کتاب حفظ الایمان میں لکھا کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ایسا ہے جیسے بچوں پاگلوں اور جانوروں کو بھی ہوتا ہے۔ (حفظ الایمان صفحہ نمبر 8 معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

(3) خلیل احمد امبیٹھوی اپنی کتاب براہین قاطع میں لکھتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ علم شیطان کو ہے۔

(براہین قاطع صفحہ نمبر 51...52 معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

ان گستاخیوں کی وجہ سے علماء حرمین نے (1903ع) میں یہ فتوی دیا تھا کہ یہ چاروں 4 گستاخ کافر ہیں اور انکے کفر پر شک کرنے والا بھی کافر ہیں۔فتوی دینے والے علماء حرمین کے نام۔

مکہ معظّمہ

(1) استادحرمین شعید شافعی۔
(2) سعید العلماء مولانا مفتی شیخ احمد عبدالخیر۔
(3) مفتی حنفیہ علامہ شیخ صالح کمال۔
(4) مفتی شیخ علی بن صدیق کمال۔
(5) شیخ الدلائل مفتی محمد عبدالحق مجاھر الیادی۔
(6) مفتی سید اسماعیل خلیل لبرارین مکہ شریف۔
(7) مولانا مفتی شیخ عمر بن ابوبکر باضنید۔
(8) علامہ مفتی شعید عبدالحسین المزرکی۔
(9) مفتی شیخ عابد بن حسین مالکی۔
(10) مفتی علی بن حسین مالکی۔
(11) مفتی محمد جمال بن محمد حسین۔
(12) مفتی شیخ اسد بن احمد دھان استاد حرامین مکہ شریف۔
(13) مفتی شیخ عبدالرحمن دھان۔
(14) مفتی شیخ محمد یوصف افغانی۔
(15) مفتی شیخ احمد مالکی الامدادی استاد حرم مدرسہ احمدیہ مکہ شریف اور خلیفہ حاجی امداد اللہ مھاجر مکی۔
(16) مفتی محمد یوصف الخیانی۔
(17) شیخ محمد صالح بن محمد فاضی۔
(18) شیخ عبدالکریم ناضی دگستانی۔
(19) شیخ محمد شعید بن محمد الیمنی۔
(20) مفتی شیخ حامد محمد الجد اوی۔

فتوی علماء مدینہ منورہ

(1) مفتی حنفیہ تاجدین الیاس۔
(2) مفتی مدینہ علامہ عثمان بن عبدالسلام دگستانی۔
(3) شیخ مالکیہ مفتی سید احمد الگیریا۔
(4) مفتی خلیل بن ابرہیم خربوتی۔
(5) شیخ الدلائل سید محمد شعید۔
(6) مفتی شیخ محبوب بن احمد عمری۔
(7) شیخ الدلائل مفتی سید عباس بن سید جلیل۔
(8) مفتی شیخ عمر بن حمدان۔
(9) مفتی شعید حکیم محمد بن محمد مدنی۔
(10) مفتی شائیہ علم سید شریف احمد برزنزی۔
(11) مفتی محمد عزیز مالکی فورملی انڈونیشیا۔
(12) مفتی شیخ محمد کیاری استاد حرم شریف مدینہ منورہ۔
(13) مفتی شیخ عبدالقادر توفیق استاد مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ہندوستان اور عرب کیکل ملا کر 265 علمائے کرام نے نے ان بدمذہبوں پر کفر کا فتوی دیا تھا۔ *-*

غزل

ساجد محمود رانا

اک درد جو بے درد نے انمول دیا ہے
ناحق زمانے میں ہمیں رول دیا ہے
خیراتِ ابد گیر ہو پھر کیسے میسر
ٹوٹا ہوا جب ہاتھ میں کشکول دیا ہے
خوش رنگ پرندوں نے ہواؤں کے بھروسے
پیڑوں کی محبت کا عجب مول دیا ہے
یوں ہے کہ حقیقت سے تعلق نہیں اس کا
جو تو نے کہانی میں مجھے رول دیا ہے
اس بار پلٹ کر نہیں آؤں گا ترے پاس
جاتے ہوئے میں نے یہ اسے بول دیا ہے

میری ماں

ایئر وائس مارشل ریٹائرڈ ملک خداداد خان صاحب

ماں کی محبت سے متعلق ایئر وائس مارشل ریٹائرڈ ملک خداداد خان صاحب کی فرستادہ دل کو چھو لینے والی اور اردو ادب کی ایک شاہکار تحریر۔

ہمیں اماں جی اس وقت زہر لگتیں جب وہ سردیوں میں زبردستی ہمارا سر دھوتیں۔لکس، کیپری، ریکسونا کس نے دیکھے تھے... کھجور مارکہ صابن سے کپڑے بھی دُھلتے تھے اور سر بھی۔آنکھوں میں صابن کانٹے کی طرح چبھتا...اور کان اماں کی ڈانٹ سے لال ہو جاتے !!! ہماری ذرا سی شرارت پر اماں آگ بگولہ ہو جاتیں...اور کپڑے دھونے والا ڈنڈا اُٹھا لیتی جسے ہم ''ڈمن'' کہتے تھے...لیکن مارا کبھی نہیں۔کبھی عین وقت پر دادی جان نے بچا لیا...کبھی بابا نے اور کبھی ہم ہی بھاگ لئے ...گاؤں کی رونقوں سے دور عین فصلوں کے بیچ ہمارا ڈیرہ تھا۔ڈیرے سے پگڈنڈی پکڑ کر گاؤں جانا اماں کا سب سے بڑا شاپنگ ٹور ہوا کرتا تھا ...اور اس ٹور سے محروم رہ جانا ہماری سب سے بڑی بدنصیبی !! اگر کبھی اماں اکیلے گاؤں چلی جاتیں تو واپسی پر ہمیں مرنڈے سے بہلانے کی کوشش کرتیں.....ہم پہلے تو ننھے ہاتھوں سے اماں جی کو مارتے.....ان کا دوپٹا کھینچتے...پھر ان کی گود میں سر رکھ کر منہ پھاڑ پھاڑ کر روتے۔کبھی اماں گاؤں ساتھ لے جاتیں تو ہم اچھلتے کودتے خوشی خوشی ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ..... شام گئے جب گاؤں سے واپسی ہوتی تو ہم بہت روتے.....ہمیں گاؤں اچھا لگتا تھا'' ماں ہم گاؤں میں کب رہیں گے ''میرے سوال پر اماں وہی گھسا پٹا جواب دیتیں.....'' جب تو بڑا ہو گا ...نوکری کرے گا...بہت سے پیسے آئیں گے...تیری شادی ہو گی... وغیرہ وغیرہ...یوں ہم ماں بیٹا باتیں کرتے کرتے تاریک ڈیرے پر آن پہنچتے...مجھے یاد ہے گاؤں میں بابا مظفر کے ہاں شادی کا جشن تھا۔وہاں جلنے بجھنے والی بتیاں بھی لگی تھیں اور پٹاخے بھی پھوٹ رہے تھے۔میں نے ماں کی بہت منّت کی کہ رات ادھر ہی ٹھہر جائیں لیکن وہ نہیں مانی۔جب میں ماں جی کے پیچھے روتا روتا گاؤں سے واپس آ رہا تھا تو نیت میں فتور آ گیا اور چپکے سے واپس گاؤں لوٹ گیا.....شام کا وقت تھا ..... ماں کو بہت دیر بعد میری گمشدگی کا اندازہ ہوا۔وہ پاگلوں کی طرح رات کے اندھیرے میں کھیتوں کھلیانوں میں آوازیں لگاتی پھری اور ڈیرے سے لیکر گاؤں تک ہر کنویں میں لالٹین لٹکا کر جھانکتی رہی۔رات گئے جب میں شادی والے گھر سے بازیاب ہوا تو وہ شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوئی۔اس رات اگر گاؤں کی عورتیں مجھے نہ بچاتیں تو اماں مجھے مار ہی ڈالتی۔ایک بار ابو جی اپنے پیر صاحب کو ملنے سرگودھا گئے ہوئے تھے۔میں اس وقت چھ سات سال کا تھا۔مجھے شدید بخار ہو گیا۔اماں جی نے مجھے لوء میں لپیٹ کر کندھے پر اٹھایا اور کھیتوں کھلیانوں سے گزرتی تین کلومیٹر دور گاؤں کے اڈے پر ڈاکٹر کو دکھانے لے گئیں۔واپسی پر ایک کھالے کو پھلانگتے ہوئے وہ کھلیان میں گر گئیں...لیکن مجھے بچا لیا... انہیں شاید گھٹنے پر چوٹ آئی...ان کے مونہہ سے میرے لئے حسبی اللہ نکلا ...اور اپنے سسرال کیلئے کچھ ناروا الفاظ...یہ واقعہ میری زندگی کی سب سے پرانی یاداشتوں میں سے ایک ہے ..... یقیناً وہ بڑی ہمت والی خاتون تھیں اور آخری سانس تک محنت مشقت کی چکی پیستی رہی...پھر جانے کب میں بڑا ہو گیا اور اماں سے بہت دور چلا گیا...سال بھر بعد جب گھر آتا.....تو ماں گلے لگا کر خوب روتی لیکن میں سب کے سامنے ہنستا رہتا۔پھر رات کو جب سب سو جاتے تو چپکے سے ماں کے ساتھ جا کر لیٹ جاتا اور اس کی چادر میں منہ چھپا کر خوب روتا۔ماں کھیتوں میں چارہ کاٹتی اور بہت بھاری پنڈ سر پر اُٹھا کر ٹوکے کے سامنے آن پھینکتی۔کبھی کبھی خود ہی ٹوکے میں چارہ ڈالتی اور خود ہی ٹوکہ چلاتی۔جب میں گھر ہوتا تو مقدور بھر ان کا ہاتھ بٹاتا۔جب میں ٹوکہ چلاتے چلاتے تھک جاتا تو وہ سرگوشی میں پوچھتی'' بات کروں تمہاری فلاں گھر میں.....؟؟'' وہ جانتی تھی کہ میں پیدائشی عاشق ہوں اور ایسی باتوں سے میری بیٹری فل چارج ہو جاتی ہے۔پھر ہم نے گاؤں میں گھر بنا لیا...اور ماں نے اپنی پسند سے

میری شادی کردی۔میں فیملی لے کر شہر چلا آیا اور ماں نے گاؤں میں اپنی الگ دنیا بسالی۔وہ میرے پہلے بیٹے کی پیدائش پر شہر بھی آئی ..... میں نے انہیں سمندر کی سیر بھی کرائی...کلفٹن کے ساحل پر چائے پیتے ہوئے انہوں نے کہا''اس سمندر سے تو ہمارے ڈیرے کا چھپڑ زیادہ خوبصورت لگتا ہے..... ماں بیمار ہوئی تو میں چھٹی پر ہی تھا...انہیں کئی دن تک باسکوپان کھلا کر سمجھتا رہا کہ معمولی پیٹ کا درد ہے...جلد افاقہ ہوجائے گا...پھر درد بڑھا تو شہر کے بڑے ہسپتال لے گیا جہاں ڈاکٹر نے بتایا کہ جگر کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے.....خون کی فوری ضرورت محسوس ہوء تو میں خود بلڈ بینک بیڈ پر جالیٹا..... ماں کو پتا چلا تو اس نے دُکھ سے دیکھ کر اتنا کہا...'' کیوں دیا خون...خرید لاتا کہیں سے...پاگل کہیں کا''میں بمشکل اتنا کہہ سکا.....''اماں خون کی چند بوندوں سے تو وہ قرض بھی ادا نہیں ہوسکتا... جو آپ مجھے اُٹھا کر گاؤں ڈاکٹر کے پاس لیکر گئی تھیں... اور واپسی پر کھالا پھلانگتے ہوئے گر گئی تھیں.....'' وہ کھلکھلا کر ہنسی تو میں نے کہا''امّاں مجھے معاف کردینا...میں تیری خدمت نہ کرسکا''میرا خیال ہے کہ میں نے شاید ہی اپنی ماں کی خدمت کی ہوگی...وقت ہی نہیں ملا ...لیکن وہ بہت فراخدل تھیں ..... بستر مرگ پر جب بار بار میں اپنی کوتاہیوں کی ان سے معافی طلب کررہا تھا تو کہنے لگی''میں راضی ہوں بیٹا ...کاہے کو بار بار معافی مانگتا ہے!!!''ماں نے میرے سامنے دم توڑا..... لیکن میں رویا نہیں...دوسرے دن سر بھاری ہونے لگا تو قبرستان چلا گیا اور قبر پر بیٹھ کر منہ پھاڑ کر رویا۔

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی

ماں سے بچھڑے مدت ہوگئی...اب تو یقین بھی نہیں آتا کہ ماں کبھی اس دنیا میں تھی بھی کہ نہیں.....!!! آج بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے پٹھانوں اور سوڈانیوں کے ہاتھوں فٹ بال بنتا بنتا جانے کیسے دیوارِ کعبہ سے جاٹکرایا...یوں لگا جیسے مدتوں بعد پھر ایک بار ماں کی گود میں پہنچ گیا ہوں.....وہی سکون جو ماں کی گود میں آتا تھا...وہی اپنائیت...وہی محبت ...جس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا..... اس بار منہ پھاڑ کر نہیں ..... دھاڑیں مار مار کر رویا!!!ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنیوالا رب کعبہ.....اور ہم سدا کے شرارتی بچے!!!!ربارحمھما کما ربیانی صغیرا

افسانہ

گھروں میں بنتے مکان

ڈاکٹر علی عباس امید

آٹھ ماہ قبل اس کا تبادلہ ہوا تھا اور ہمارے ہی دفتر میں اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔وہ ہی بہت زندہ دل اور بیحد خوش مزاج انسان تھا۔کام کرنے میں اتنا ماہر تھا کہ لوگ اس کا موازنہ کمپیوٹر سے کرنے لگے تھے۔ اعلیٰ افسران تو اس کی مثال دینے میں بھی نہیں ہچکچاتے تھے کبھی بھی وہ اپنا کام پینڈنگ نہیں کرتا تھا۔بیچ بیچ میں ہنسنے ہنسانے کے ساتھ ساتھ ہی وہ دوسروں کے کام میں بھی مدد دیتا رہتا تھا کیونکہ اس کی ٹیبل میری ٹیبل کے قریب تھی اس لئے مجھ سے کچھ زیادہ ہی قربت تھی۔اس نے رہائش کے لئے ایک مکان لیا جو میرے گھر کے راستے میں تھا لہذا اکثر واپسی بھی ساتھ ہوتی۔کبھی کبھی ہم آپس میں گھومنے بھی نکل جاتے تھے۔اس کی گفتگو کا زیادہ حصہ اس کے گھر کے اردگرد گھومتا رہتا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان سب کو ٹوٹ کر چاہتا ہے اور ان سے الگ رہنا ان کے لئے کسی قدر تکلیف دہ مسئلہ ہے۔ایک شام دفتر سے لوٹتے ہم دونوں ایک کیفے میں بیٹھ گئے۔اس نے بتایا کہ مسلسل گھر سے دور رہنے کی وجہ سے اسے نہ صرف تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا ہے بلکہ ایک طرح کی ذہنی اذیت بھی اس پر غالب آتی جارہی ہے۔میں نے مشورہ دیا کہ وہ چند دنوں کے چھٹی لے کر گھر والوں سے مل آئے۔اس نے بتایا کہ وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔مہینہ کے آخر میں وہ چھٹی لے کر وہ ہفتہ بھر کے لئے اپنے گھر چلا گیا۔واپس آیا تو مطمئن دکھا اور واپس اپنے کام لگ گیا۔اس کی خوش مزاجی اور کارکردگی پہلے کی طرح تھی۔مجھے خوشی ہوئی کہ گھر کے لئے اس کی بے چینی ختم ہوئی۔ ہمارے دن پہلے کی طرح ہی گزرنے لگے۔چند ماہ بعد اُس نے بتایا کہ آئندہ ماہ وہ اپنے گھر جارہا ہے تاکہ گھر والوں کو یہاں لانے کا پروگرام بنا سکے۔وہ چلا گیا ساتھ کام کرنے والوں کو اس کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔اس کی وجہ تھی اس کی خوش مزاجی اور محنت، چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لوٹ آیا لیکن اس بار وہ کچھ مضمحل تھا۔میں نے سوچا سفر کی تھکان مزاج پر بھاری پڑ گئی ہوگی۔نوکری تو بہر حال نوکری ہے۔وہ کام میں لگ گیا۔اس کی کارکردگی تو بدستور تھی مزاج میں

فرق آ گیا تھا۔زندہ دلی پر سنجیدگی حاوی ہونے لگی تھی۔ چونکہ میرا ساتھ زیادہ رہتا تھا اس وجہ سے یہ بدلاؤ زیادہ محسوس کرنے لگا تھا۔لیکن چاہتے ہوئے بھی میں پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

یہاں پوسٹنگ کے دو سال پورے ہونے کے بعد وہ تیسری بار اپنے گھر گیا۔اس بار نہ جانے کیوں وہ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے لوٹ آیا۔ مجھے بے حد حیرانی ہوئی کہ گھر کے لئے بے چین رہنے والا کیوں تنہائی اور ذہنی اذیت کو دانستہ قبول کر رہا ہے۔میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور سلسلہ حسب سابق چلتا رہا۔کام میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ہاں یہ ضرور ہوا کہ اب میرے علاوہ آفس کے تمام ساتھی اس کی خاموشی کو محسوس کرنے لگے تھے۔اس دن ہمارے پاس کچھ زیادہ وقت تھا۔دونوں ہی مصروف تھے۔دفتر کا کام تمام ہونے کے کافی دیر بعد ہم نکلے تھکان کو زیر کرنے کے خیال سے میں نے قریبی چائے خانہ میں چلنے کی تجویز رکھی۔وہ خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑا چائے پیتے ہوئے میں نے ہمت کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔اس بار چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی گھر سے آ گئے۔اب بالکل خاموش رہنے لگے ہو۔دفتر کے ساتھیوں میں بھی تمہاری اداسی شدت سے موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ خاموش رہا پھر گیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا بولا۔''اب آپ سے کیا چھپانا گھر میں بیوی کے علاوہ ایک لڑکی اور اور ایک لڑکا ہے۔ پہلی بار میں جب گیا تھا تو بیوی نے کہا کہ بیٹی کا امتحان ہے اور بیٹے کو کسی ملازمت کے لئے انٹرویو دینا ہے۔دوسری دفعہ میرے پہنچنے پر بیوی نے بتایا کہ بیٹی ضد کر رہی ہے کہ یہیں پڑھے گی اور بیٹا یہاں رہ کر ملازمت ڈھونڈنے پر مصر ہے۔بچوں کی ضد کو بیوی سے تقویت مل رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یکجا رہنے اور اخراجات میں کمی تو ہوگی اور فکر مند ہونے سے بھی بچیں گے۔اور پھر میں چلا آیا۔اس بار جب میں گیا تو گھر کا پارہ پارہ ہو گیا تھا۔میں جن کے بغیر بے چین رہتا ہوں ان کا عالم یہ تھا کہ بیٹی اور بیٹے کو شاید یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ میں ان کے بیچ ہوں اور بیوی کا زیادہ وقت ٹی وی اور وٹس ایپ پر گزرتا تھا ایک بار جب میں نے خود ہی دبی زبان میں اس سے بات کی تو وہ بولی''ہم لوگ یہیں رہیں گے۔یہ سب کے لئے بہتر ہے اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔

کیا اپنے ہی گھر والوں کے لئے میں اتنا اجنبی ہوں کہ میرے ساتھ رہنا بھی انہیں گوارا نہیں۔کیا میرے جینے کا مقصد نوکری اور ان کی پرورش ہے۔آپ ہی بتائیں میں کیا بتاتا میرا حال تو اور بدتر تھا۔گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی بیگانہ تھا۔چوبیس گھنٹوں میں صرف دو لفظ ناشتہ اور کھانا سنتا تھا۔ پورا جملہ اسی وقت سننے کا موقعہ ملتا جب انہیں مجھ سے کوئی کام ہوتا۔میں اپنے ہی گھر میں مسافروں جیسی زندگی بسر کر رہا تھا۔تھوڑی دیر تک ہم سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر اُٹھ گئے۔ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو اُجالا تھا اور نکلے تو چاروں طرف اندھیرے کا قبضہ تھا۔اس کے ذہن میں میرا گھر اور میری سوچ میں اس کا مکان۔دونوں ہی گہری تاریکی میں بڑھتے جا رہے تھے۔اس منزل کی طرف جو دونوں کے نصیب کو ایک کرتی تھی۔

(بشکریہ ماہنامہ تریاق اکتوبر ۲۰۱۶)

کراچی کی انتہائی مختصر سی دلچسپ تاریخ

کراچی ایک قدرتی بندرگاہ ہے جس کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے اور کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم وادی سندھ میں اپنی مہم کے بعد فوج کی واپس روانگی کے لیے کروکولا (کراچی) میں مقیم ہوا۔عرب اس علاقہ کو دیبل کے نام سے جانتے تھے جس میں موجودہ کراچی کے چند علاقے اور جزیرہ منوڑہ وغیرہ شامل تھے۔تاہم 1772 میں کولاچی نامی گاؤں تجارتی مرکز میں تبدیل ہونا شروع ہوا تو شہر کی فصیل بنائی گئی جس کے ایک دروازے کا رُخ سمندر کی طرف تھا جسے کھارادر کا نام دیا گیا جبکہ لیاری ندی والے دروازے کو میٹھادر کہا گیا۔انگریزوں نے 1839 میں اس شہر پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور پھر اسے ضلع کی حیثیت دے دی جس کے بعد یہ پھیلنا شروع ہو گیا۔یہی وجہ ہے کہ یہاں اکثر پرانی عمارات کا فن تعمیر کلاسیکی برطانوی نوآبادیاتی طرز کا ہے۔1936 میں سندھ کو صوبہ بنایا گیا تو کراچی اس کا دارالحکومت بنا جبکہ 1947 میں پاکستان کے قیام کے بعد یہ پاکستان کا دارالحکومت بن گیا،اُس وقت شہر کی آبادی چند لاکھ تھی مگر پاکستانی صدر مقام بننے کی وجہ سے اس کی آبادی بڑھنے لگی۔اب کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور صنعتی و تجارتی مرکز ہے۔ (بشکریہ۔عاصی صحرائی)

مہندر سنگھ بیدی کے جوتے

نیلوفر فردوس

راجندر سنگھ بیدی حلقہ ادب میں عموماً عورت اور جنس کے حوالہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔عورت اور جنس اس سماج کی حقیقت اور ضرورت ہیں ۔ زندگی میں عورت کی ضرورت، اہمیت اور حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ایسے میں اگر بیدی کی تخلیقات میں عورت اور جنس نمایاں ہیں تو حیرانی کی بات نہیں ہے البتہ ان موضوعات کے ساتھ بیدی کے افسانوں میں جو سماجی بصیرت، انسانی حقیقت اور جذبات و احساسات کی شدت موجود ہے اسپر نہ صرف حیرانی ہوتی ہے بلکہ یہ ناقابل فراموش بھی ہیں۔

بیدی کے مجموعہ ''گرہن میں شامل دو افسانے ''ہڈیاں اور پھول'' اور ''رحمٰن کے جوتے'' ایسے ہی افسانے ہیں جہاں عورت کے ساتھ انسانی اور سماجی حقیقت اور جذبات واحساسات کی شدت بھی موجود ہے۔ دونوں ہی افسانوں میں جوتوں سے شروع ہو کر معاشرتی حقیقت پر ختم ہوتے ہیں ۔ان افسانوں کے کردار معمولی اور ان کے مسائل بھی عام تھے۔افسانہ ''رحمٰن کے جوتے'' کا رحمٰن غریب پینشن یافتہ معدے کے مرض میں مبتلا ءضعیف آدمی ہے جو نہایت جذباتی حساس اور توہم پرست ہے۔ وہ اپنے جوتوں کے ایک دوسروں کے اوپر چڑھ جانے کو مستقبل قریب میں کسی سفر کی علامت سمجھتے ہوئے زندگی سے موت تک کا سفر طے کر لیتا ہے۔رحمٰن اور اور اس کی بیوی اپنی بیٹی جینا سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن کچھ اپنی بیماری لاچاری غریبی کی وجہ سے تو کچھ جینا کے افسر شوہر کی وجہ سے بیٹی کے ملنے سے قاصر ہیں۔ جینا کا وہی حال ہے جو عموماً ہندوستانی گھرانوں کی روایت ہوتی ہے یعنی عورت شادی سے پہلے ماں باپ کی عزت اس کے بعد شوہر کی ملکیت اور پھر بیٹوں کی وراثت ہوتی ہے نہ اس کے کوئی احساس ہوتے ہیں نہ اس کے کوئی جذبات۔اس کا جنم صرف حکم کی تعمیل کرنے کے لئے ہوتا ہے جب اسے جو رشتہ نبھانے کا حکم صادر ہوتا ہے وہ بغیر چوں چراں کہ اس رشتہ کو جیتی یا کبھی کبھی کاٹ لیتی ہے۔ جینا کو اس کے والدین کو ملنے آئے ہوئے دو سال ہونے کو آئے تھے ان دو سالوں میں آخری چند ماہ رحمٰن نے بڑی مشکل سے گزارے تھے اسے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دہکتا ہوا اُپلا اس کے دل پر رکھا ہوا ہے۔ جوتوں کے ایک دوسروں پر چڑھ جانے کی واردات سے رحمٰن جینا سے اس کی سسرال انبالہ جا کر ملنے کا ارادہ کرتا ہے۔ بیٹی سے ملاقات کے خیال سے ہی وہ پرسکون مطمئن اور سرشار تھا اور خیال کرتا تھا کہ جا کر ملنا کتنا سکون بخش ہوگا جب خیال اتنا تسکین دہ ہے۔ بیٹی کے لئے محبت اور تڑپ ہی رحمٰن کو سفر کا ارادہ کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ بیدی نے رحمان اور جینا کے حوالے سے ایک بیٹی کے لئے اس کے والدین کے جذبات واحساسات کی ایسی تپش پیش کی ہے جو شاید زمانے کے تمام والدین اپنی بیٹیوں کیلئے محسوس کرتے ہوں گے۔ایسا ہی ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔جس میں ایک شادی شدہ بیٹی کے لئے والد کی محبت اور شدت کے ساتھ اسکے ذہنی اُدھیڑ بُن کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے'' ناحق اتنی بڑی ہوگی جینا۔بچپن میں جب کھیل کود کر باہر سے آتی تھی تو اُسے سینہ سے لگا لینے سے سینہ میں ٹھنڈ پڑ جاتی تھی اُن دنوں دل پر سلگتا ہوا اُپلہ رکھا ہوا معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اب وہ اسے صرف دور ہی سے دیکھ سکے گا۔'' صفحہ 24 مجموعہ گرہن جذبات اور احساسات کی یہ شدت بیدی کی تقریباً تمام تر تخلیقات میں موجود ہے۔اس افسانے کے مطالعہ سے یہ خام خیالی بھی دور ہو جاتی ہے کہ بیدی کے یہاں صرف عورت یا جنس اہم ہیں بلکہ یہ خیال پروان چڑھتا ہے کہ بیدی کے یہاں عورت کے نیک روپ اپنے حقیقی رنگ اور گوناگوں مسائل کے ساتھ مختلف رشتوں کی ڈور میں بندھی ہوئی ہے۔ کہیں یہ عورت ماں ہے، کہیں یہ بیوی تو کہیں بہن یا بیٹی۔اس افسانے میں بیدی کے سماج کے اہم مسئلہ طبقاتی کشمکش کو بھی بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ دوران سفر جب رحمٰن کا سامان غائب ہو جاتا ہے ایسے

میں کانسٹیبل اور ٹکٹ چیکر خوش پوش لوگوں کی رائے سے رائے ملاتے ہوئے رحمان کو ہی قصوروار ٹھہرایا اور نہ صرف اسے گالیوں سے نوازا بلکہ لات گھونسوں سے لہوں لہان کرتے ہوئے گاڑی سے اُتار دیا اس طرح آخر میں رحمان بیٹی سے ملنے کے ارمان دل میں لئے ہوئے زادِراہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے اور ایک بڑے لمبے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔اس حادثہ پر قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر رحمان غریب نہ ہوتا اور خوش پوش لوگوں میں شامل ہوتا تو شاید، اسے دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

مرد اور عورت کے رشتے اور کشمکش پر مبنی بیدی کو افسانہ ''ہڈیاں اور پھول'' اہم نہیں تو دل چسپ ضرور ہے۔ملّم اور گوری اس افسانہ کے اہم کردار ہیں ملّم ایک غصیلا موچی ہے جو جوتوں کی مرمت کر کے اکثر ان میں لپا لگاتا ہے جوتوں کو ٹھونکتے بجاتے وہ اپنی بیوی کو بھی ٹھونک بجا کر میکے کی راہ دکھا دیتا ہے اور اسی کشمکش میں رہتا ہے کہ شاید گوری مر چکی ہو کیوں کہ میکے جانے سے پہلے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکی تھی جیسا کے عموماً ہندوستانی عورتوں کا حال ہوتا ہے یہ عورتیں گھر اور کنبے کا خیال رکھتے رکھتے خواہ اَدھ مری بیمار اور لاچار ہو جاتی ہیں۔یوں مرد عورت پر ظلم وستم کو اپنی شان تو عورت سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کے تحت ظلم وستم کو اپنی قسمت یا اپنے کسی غلط فعل کی پھل مان بیٹھی ہے، جانے کب تک سماج میں یہ ڈھونگ چلتا رہے گا۔

ملّم کے دماغ میں بیوی کے متعلق کوئی تضادات ہیں وہ صرف ملّم کے خیالات کی گرہیں نہیں کھولتی ہیں بلکہ عورت کے لئے مرد حضرات کی نفسیات کے دورخے پن کی بھی عقدکشائی کرتی ہیں۔ایک طرف تو ملّم کو گوری کے بغیر زندگی گزارنا دوبھر ہو جاتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں اس سے وابستہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے دل بہلانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری طرف اس کے ساتھ ہونے پر طعن وتشنیع کئے بغیر بھی نہیں رہ نہیں سکتا۔یہی نہیں گوری کے میکے چلے جانے پر نہ صرف شدت سے اس کا انتظار کرتا ہے بلکہ آخری بار گوری کی سمادھی پر جا کر افسوس کرنے کی بھی خواہش دل میں رکھتا ہے۔افسانہ کا ایک ایسا ہی اقتباس ملاحظہ کیجئے جو انسانی فطرت پر طنز ہے۔''جب اس کی بیوی دلہن بن کر آئی تو ملّم اس کی جوانی اور خوبصورتی کی بے طرح پاسبانی کرنے لگا۔وہ اسے دروازہ میں کھڑی دیکھتا تو پیٹنے لگتا۔یہ شک وشبہ کی عادت ابھی تک باقی تھی اس وقت کے گوری کا جسم توانا اور بھرا ہوا تھا وہ اُسے کہتا رہا مجھے ایک پتلی اور نازک عورت پسند ہے اور جب وہ دبلی ہو گئی تو کہنے لگا مجھے مریل عورتوں سے سخت نفرت ہے۔

اسی طرح دونوں افسانہ عام کرداروں کے ساتھ جوتوں سمیت پاپیادہ رفتار پکڑتے ہوئے سماج کی حقیقت کو سامنے لانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔دونوں ہی افسانوں میں سماج کا ایک اہم مسئلہ توہم پرستی کے سبب زندگی سے موت کا سفر مشترک ہے۔ایک طرف رحمان توہم پرستی کے سبب زندگی سے موت کا سفر کرتا ہے دوسری طرف گوری چترّی کا چاند دیکھ لینے کے بعد میکے سے سسرال نہیں جاتی ہے۔دراصل بیدی انسان اور انسانی زندگی کے نباض ہی نہیں بلکہ وہ ماہر نفسیات بھی ہیں انہوں نے رحمان اور ملّم جیسے معمولی کرداروں کا نبض اتنی باریک بینی سے پکڑا ہے کہ عام کرداروں کی خاص نفسانیت کی پرتیں کھلی چلی جاتی ہیں۔

(بشکریہ ماہنامہ تریاق اکتوبر ۲۰۱۶)

دین کی ہانڈی

ارشاد بھٹی اپنے کالم میں لکھتے ہیں۔

دوسروں کی زندگی جہنم بنا کر سجدوں میں جنتیں تلاش کرتے مسلمانوں سے' دلوں کو توڑ کر مسجدیں آباد کرتے مومنوں تک' اپنی اولادوں کو سینوں سے لگا کر دوسروں کے بچوں میں شہادتیں بانٹتے روحانی باپوں سے' ماں باپ کو بھلا کر ڈالرنگری میں گم ہو چکے بچوں تک' بے آس رشتہ داروں' مجبور دوستوں اور بہنوں بیٹیوں کو ننگے سر چھوڑ کر عمرے اور حج کرتے کلمہ گوؤں سے' اسلام سے اپنی مرضی کے اسلام نکالتے حرم کے پاسبانوں تک' مخلوق کی پوجا کر کے خدا کو ایک ماننے بندوں سے' یہود ونصاریٰ کی زندگی بسر کر کے آخرت میں نبی ﷺ کی شفاعت کے خواہشمندوں تک اور ہر قسم کی ذخیرہ اندوزی اور ہر طرح کی مہنگائی کر کے رکوع وسجود میں روتے تہجد گزاروں سے' آنکھ' کان' زبان اور دل کو کھلا چھوڑ کر صرف چند گھنٹے کی ''منہ بندی'' کو رمضان سمجھتے روزہ داروں تک جب میں یہ دیکھوں کبھی کسی نے نبی ﷺ کی زندگی پر توجہ ہی نہ دی' کبھی کسی نے رسول کے 63 سالوں پر دھیان ہی نہ دیا اور جب میں یہ

دیکھوں کہ دین کی کوئی ایسی بات نہ رہ جائے کہ جو نبی ﷺ نے بتا نہ دی ہو اور زندگی کی کوئی ایسی شے نہ بچے جو نبی ﷺ نے سمجھا نہ دی ہو تو پھر میرا دل کرے کہ آج رسول ﷺ خدا کی روشن زندگی کے چند روشن پہلو اپنے اُن ہم وطنوں کی نذر کروں کہ جن کا ظاہر اور باطن اب ایسا ہو چکا کہ ان کا آئیڈیل تو عبدالستار ایدھی مگر منزل نواز شریف۔

اس کے بعد سیرۃ النبی ﷺ کے کئی پُر اثر واقعات درج کر کے لکھتے ہیں۔

دوستو یہ تو اسوہ حسنہ کے چند نمونے اور چند جھلکیاں، یقین جانئے روشن زندگی کے ایسے لاکھوں، کروڑوں روشن پہلو اور بھی مگر جیسے یہ سب کچھ سچ ویسے ہی یہ بھی سچ کہ یہ سچ وہاں بتانے کا کیا فائدہ کہ جہاں رسول ﷺ سے محبتیں ایسی کہ سنتیں بھی ٹوٹیں اور میلاد بھی ہوں اور اُسوہ حسنہ پر عمل بھی کوئی نہ کرے اور درود کو بخشش کا ذریعہ بھی سب سمجھیں، مجھے تو یہ سوچ کر ہی شرمندگی ہو کہ وہ نبی جو رو رو کر اپنی اُمت کیلئے دعائیں مانگا کرتے تھے، جنہوں نے اپنی اُمت کی خاطر پیٹ پر پتھر باندھے اور اُمت کی آخرت کیلئے جن کے قیام اتنے لمبے ہوتے کہ پاؤں سُوج جاتے، جب اسی نبی ﷺ کے اُمتی پیٹ پر دنیا باندھے حلال حرام سے بھری شکمیں لئے ''میں میں'' کے طواف کرتے کرتے حساب والے دن آپ کے سامنے پہنچیں گے تو آپ ﷺ کیا سوچیں گے، آج 'اللہ غفور و رحیم ہے'' کہہ کر دین کی ہانڈی کو من پسند تڑکے لگانے والو جب کبھی فرصت ملے تو اُس دن کے بارے میں ضرور سوچنا کہ جس دن نبی ﷺ سامنے ہوں گے۔ (روزنامہ جنگ 23 جون 2016ء)

غزل۔ امجد مرزا امجد

یہ حادثہ ساتھ مرے اکثر جو ہو گیا
پھولوں کی آرزو میں وہ کانٹے چبھو گیا

آیا تھا وہ خوشی و مسرت کو بانٹنے
جانے لگا نجانے کیوں آنکھیں بھگو گیا

آنکھوں کا تھا خمار کہ وہ تھی مانندِ حور
نہ کچھ رہا ہوش، کہ دیوانہ ہو گیا

کپڑے ہوئے ہیں تار تار زخمی ہوئے پاؤں بھی
گھر کے صحن میں وہ جو کانٹے ہی بو گیا

ہم نے تو سونپ رکھی تھی امجدؔ کو ناخدائی
آیا طوفاں یہ کیسا کہ سفینے ڈبو گیا

مذہب کے نام پر استحصال اخبار و جرائد سے

جناب پروفیسر ثاقب علی صاحب اپنے کالم میں تحریر کرتے ہیں۔

پاکستانی سیاست میں مذہبی اور غیر مذہبی تقسیم کی بنیاد کیا ہے؟ جو جماعتیں صرف عرف عام میں مذہبی نہیں ہیں کیا وہ مذہب کو نہیں مانتیں؟ کیا ہماری آج کی حکومت غیر مذہبی ہے؟ ان سوالات کے جواب کیلئے ہمیں ایک خاص زاویے سے اپنی سیاسی تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں بعض لوگوں نے سیاسی عزائم کیلئے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ یہ انہی کا گروہ ہے جو معاشرے میں اسلام کا نفاذ چاہتا ہے اور اگر آپ اسلام چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کا ساتھ دیا جائے۔ اس میں بین السطور یہ پیغام ہے کہ وہ تو اسلام چاہتے ہیں دوسرے نہیں چاہتے۔ چنانچہ وہ بزعم خویش یہ حق صرف اپنے لئے ثابت کرتے ہیں کہ وہی مذہب کی تعبیر و تشریح کر سکتے ہیں اور مذہب کے جملہ حقوق ان کے نام محفوظ ہیں۔ ان کا فرمانا ہی مذہب ہے اور وہی یہ استحقاق رکھتے ہیں کہ ملک میں اسلام نافذ کریں۔ چنانچہ وہ اسلام کے نام پر لوگوں کا استحصال کرتے ہیں اور غریب و سادہ لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔

اس صورت حال کا دو طرح سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ کیا ان کا ایسا کوئی حق ثابت ہے دوسرا یہ کہ آج تک یہ لوگ مذہب کے علمبردار رہے ہیں تو ان کے تصور مذہب نے لوگوں کو کیا دیا؟ لوگوں کے مسائل اس کی وجہ سے حل ہوئے یا یہ اپنے مسائل ہی حل کرتے رہے؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو ان کا یہ حق کسی طرح ثابت نہیں۔ دین اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کا نام ہے۔ اللہ کی کتاب محفوظ ہے اور ہر مسلمان گھرانے میں موجود ہے۔ اس کی بیشمار تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور دنیا کی ہر زبان میں اس کے کئی تراجم ہو چکے ہیں ایک عام پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور اللہ کی کتب اس سے کیا مطالبہ کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ سنت ایک تواتر کے ساتھ نسل اُمت میں منتقل کی ہوتی آتی ہے اور عام

آدمی کے ذہن میں ان امور پر کوئی ابہام موجود نہیں ہے۔ پھر اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو معاشرے میں ایسے علماء موجود ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا درس وتدریس ہے۔ جو دن رات دین پر غور کرتے ہیں اور اس کے مسائل سے آگاہ ہیں۔ آدمی ان کی طرف رجوع کر کے جان سکتا ہے کہ دین کیا ہے۔ اس سارے عمل میں ان لوگوں کو سرے سے کوئی کردار ہی نہیں ہے۔ جو سیاست میں مذہب کا علم پکڑے کھڑے ہیں۔ وہ علماء جو دین جانتے ہیں وہ تو کبھی سیاست کا رخ نہیں کرتے اور جو سیاست کرتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ صبح وشام سیاست کرتے ہیں ان کے پاس نہ تو مطالعے کا وقت ہوتا ہے نہ سوچنے کی فرصت۔ ان سے دین کیسے سیکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے مذہب کی تعلیم ونفاذ کے لئے ان سیاسی علماء کا سرے سے کوئی کردار ہی نہیں۔ اس لئے یہ بات واضح ہے کہ معاشرے میں دین کی بقاء اور دین کا علم جاننے کیلئے مذہبی سیاست دانوں کی نہ پہلے ضرورت تھی نہ اب ہے۔

اب دوسرے سوال کی جانب آتے ہیں۔ ان لوگوں نے مذہب کے نام پر ملک میں تفرقہ پیدا کیا ہے کسی نے فقہ حنفی کا جھنڈا اُٹھایا ہے۔ کوئی فقہ جعفریہ کا نفاذ چاہتا ہے یوں فقہ کے نام پر ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے دُور کر دیا ہے اور معاشرے میں مذہبی منافرت پھیلائی ہے۔ مسلک کے نام پر مسجد ومدرسے پر قبضہ کیا ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑایا ہے۔ انہوں نے قومی سیاست میں مذہب کا کوئی ایسا تصور پیش نہیں کیا جس میں لوگوں کی فلاح وبہبود کی کوئی بات ہے۔ ان کا فہم دین بس اتنا ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے نفاذ اسلام کیلئے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ملک میں حدود قوانین نافذ کر دو۔ یعنی ان کا مذہب بس یہی ہے کہ چند جرائم کی سزا نافذ کر دی جائے۔ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اسلام وہ معاشرہ کس طرح قائم کرتا ہے جہاں جرائم کے امکانات اور اسباب ختم ہو جاتے ہیں گویا یہ لوگ معاشرے کو مذہب کے روشن پہلو نہیں دکھا سکے بلکہ انہوں نے جو تصور دین پیش کیا وہ لوگوں کو مذہب سے دور کرنے کا باعث بنا ہے۔

(روزنامہ اساس لاہور 19 جون 2005ء)

ابراہام لنکن کا اپنے بیٹے کے ٹیچر کو وہ خط جو تمام ماں باپ کو ضرور پڑھنا چاہیئے لنکن کا والد ایک کاریگر انسان تھا، یہ کسان بھی تھا، جولاہا بھی اور موچی بھی، یہ جوانی میں کارڈین کاؤنٹی کے اُمراء کے گھروں میں جاتا تھا اور ان کے خاندان کے جوتے سیتا تھا، 1861ء میں ابراہام لنکن امریکہ کا صدر بن گیا، اس وقت امریکی سینٹ میں جاگیرداروں، تاجروں، صنعتکاروں اور سرمایہ کاروں کا قبضہ تھا، یہ لوگ سینٹ میں اپنی کمیونٹی کے مفادات کی حفاظت کرتے تھے۔ ابراہم لنکن صدر بنا تو اس نے امریکہ میں غلامی کا خاتمہ کر دیا، اس نے ایک فرمان کے ذریعے باغی ریاستوں کے غلاموں کو آزاد کر کے فوج میں شامل کر لیا، امریکی اشرافیہ لنکن کی اصلاحات سے براہ راست متاثر ہو رہی تھیں چنانچہ یہ لوگ ابراہم لنکن کیخلاف ہو گئے، یہ ابراہم لنکن کی شہرت کو بھی نقصان پہنچاتے تھے اور اس کی کردار کشی کا بھی کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے، یہ لوگ سینٹ کے اجلاس میں عموماً ابراہم لنکن کا مذاق اُڑاتے تھے لیکن لنکن کبھی اس مذاق پر دُکھی نہیں ہوا، وہ ہمیشہ کہتا تھا میرے جیسے شخص کا امریکہ کا صدر بن جانا ان تمام لوگوں کے ہزاروں لاکھوں اعتراضات کا جواب ہے چنانچہ مجھے جواب دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ابراہم لنکن کس قدر مضبوط اعصاب اور حوصلے کا مالک تھا آپ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگا لیجئے، یہ اپنے پہلے صدارتی خطاب کیلئے سینٹ میں داخل ہوا، یہ صدر کیلئے مخصوص نشست کی طرف بڑھ رہا تھا اچانک ایک سینیٹر اپنی نشست سے اُٹھا اور ابراہم لنکن سے مخاطب ہو کر بولا، ''لنکن صدر بننے کے بعد یہ مت بھولنا تمہارا والد میرے خاندان کے جوتے سیتا تھا''۔

یہ فقرہ سن کر پورے سینٹ نے قہقہہ لگایا۔ لنکن مسکرایا اور سیدھا ڈائس پر چلا گیا اور اس رئیس سینیٹر سے مخاطب ہو کر بولا ''سر! میں جانتا ہوں میرا والد آپ کے گھر میں آپ کے خاندان کے جوتے سیتا تھا اور آپ کے علاوہ اس ہال میں موجود دوسرے اُمراء کے جوتے بھی سیتا رہا لیکن آپ نے کبھی سوچا امریکہ میں ہزاروں موچی تھے مگر آپ کے بزرگ ہمیشہ میرے والد سے جوتے بنواتے تھے کیوں؟ اس لئے کہ پورے امریکہ میں کوئی موچی میرے والد سے اچھا جوتا نہیں بنا سکتا تھا، میرا والد ایک عظیم فنکار تھا، اس کے بنائے ہوئے جوتے محض جوتے نہیں ہوتے تھے، وہ ان جوتوں میں اپنی روح ڈال دیتا تھا، میرے والد کے

پورے کیریئر میں کسی نے ان کے بنائے ہوئے جوتے کی شکایت نہیں کی۔آپ کو آج بھی میرے والد کا بنایا جوتا تنگ کرے تو میں حاضر ہوں۔میں بھی جوتا بنانا جانتا ہوں، میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے نیا جوتا بنا کردوں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی میرے والد کے کام کی شکایت نہیں کرے گا کیونکہ پورے امریکہ میں میرے والد سے اچھا موچی کوئی نہیں تھا۔وہ ایک عظیم فنکار، ایک جینئس اور ایک عظیم کاریگر تھا اور مجھے اس عظیم موچی کا بیٹا ہونے پر فخر ہے'' ابراہم لنکن نے تقریر ختم کی اور صدارت کی کرسی پر بیٹھ گیا، پورے ہال کو سانپ سونگھ گیا، لنکن پر فقرہ کسنے والے سینیٹر نے شرمندگی کے عالم میں سر جھکایا اور اس کے بعد کسی امریکی سیاستدان نے لنکن کو موچی کا بیٹا نہیں کہا۔ابراہم لنکن نے اپنے بیٹے کے استاد کو ایک شہرہ آفاق خط لکھا، جو پاکستان کے تمام والدین کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔

ابراہم لنکن نے اپنے بیٹے کے استاد کو لکھا میرے بیٹے کو وہ طاقت عطا کرنے کی کوشش کیجیئے کہ یہ ہر شخص کی بات سنے لیکن یہ بھی بتایئے کہ جو کچھ سنے اسے سچ کی کسوٹی پر پرکھے اور درست ہو تو عمل کرے۔اسے دوستوں کیلئے قربانی دینا سکھایئے۔اسے بتایئے کہ اداسی میں کیسے مسکرایا جاتا ہے، اسے بتایئے کہ آنسوؤں میں کوئی شرم نہیں۔اسے سمجھایئے کہ منفی سوچ رکھنے والوں کو خاطر میں مت لائے اور خوشامد اور بہت زیادہ مٹھاس سے ہوشیار رہے۔اسے سکھایئے کہ اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا بہترین معاوضہ وصول کرے لیکن کبھی بھی اپنی روح اور دل کو بیچنے کی کوشش نہ کرے۔اسے بتایئے کہ شور مچاتے ہوئے ہجوم کی باتوں پر کان نہ دھرے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے تو اپنی جگہ پر قائم رہے، ڈٹا رہے۔آپ اس کے استاد ہیں اس سے شفقت سے پیش آیئے مگر پیار اور دلاسہ مت دیجیئے۔کیونکہ یاد رکھیئے، خام لوہے کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی فولاد بنایا کرتی ہے۔اسے سیکھنا ہوگا کہ ہر شخص کھرا نہیں ہوتا۔لیکن اسے یہ بھی بتایئے کہ ہر غنڈے کے مقابلے میں ایک ہیرو بھی ہوا کرتا ہے۔ہر خودغرض سیاستدان کے مقابلے میں ایک دوست بھی ہوا کرتا ہے۔آپ اسے حسد سے دور کردیں۔اگر آپ کرسکیں تو اسے خاموش قہقہوں کے راز کے بارے میں بھی بتایئے۔اس کو یہ سیکھ لینا چاہئے کہ بدمعاشوں کا مقابلہ کرنا سب سے آسان کام ہوا کرتا ہے۔اگر آپ بتا سکیں تو اسے کتابوں کے سحر کے بارے میں بتایئے، لیکن اسے اتنا وقت ضرور دیجیئے کہ وہ آسمانوں پر اُڑنے والے پرندوں کے دائمی راز، شہد کی مکھیوں کا سورج سے تعلق اور پہاڑوں سے پھوٹنے والے پھولوں پر بھی غور کرسکے۔اسے بتایئے کہ سکول میں نقل کرکے پاس ہونے سے فیل ہو جانا زیادہ باعزت ہے۔اسے بتایئے کہ جب سب کہتے بھی رہیں کہ وہ غلط ہے تو اپنے خیالات پر پختہ یقین رکھے.....

جستہ جستہ۔ عاصی صحرائی

یقین:: چند باتوں پہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر جاہل ملاؤں کی جگہ انگریز آج حاکم ہوتا تو کم از کم بجلی پانی، خوراک اور تعلیم کی کمی ہمیں نہ دیکھنی پڑتی۔

وقت:: وقت نے ثابت کردیا ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے تینوں فیصلے دُرست تھے ۔۱۔نواز شریف کی گرفتاری۔۲۔لال مسجد اپریشن۔۳۔جسٹس افتخار کی تنزلی۔

جمہوریت:: پاکستان کی جمہوریت اور طوائف کے کوٹھے میں ایک قدر مشترک ہے دونوں کے دروازے غریب کے لئے بند اور اشرافیہ کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔

سچائی:: سفر کا مزہ لینا ہو تو ساتھ میں سامان کم رکھیں. زندگی کا مزہ لینا ہو تو دل کے ارمان کم رکھیں۔☆مٹی کی پکڑ بہت مضبوط ہوتی ہے. سنگ مرمر پر تو پاؤں ہی پھسلا کرتے ہیں۔☆زندگی کو اتنا سیریس مت لو۔دنیا سے زندہ کوئی بھی نہیں گیا۔☆جن کے پاس سِکّے تھے وہ مزے سے بارش میں بھیگتے رہے. جن کے پاس نوٹ تھے وہ چھت تلاش کرتے رہ گئے۔☆پیسہ انسان کو اوپر لیجا سکتا ہے لیکن انسان پیسے کو کبھی اوپر لے کر نہیں جا سکتا۔☆کمائی چھوٹی یا بڑی ہوسکتی ہے لیکن روٹی کا سائز ہر گھر میں ایک جیسا ہی ہوتا ہے. ☆انسان کیا چاہتا ہے کہ اُڑنے کو پر ملیں اور پرندے کی چاہت ہے رہنے کو گھر ملے۔☆چھوٹی چھوٹی باتیں دل میں رکھنے سے بڑے بڑے رشتے کمزور ہو جاتے ہیں۔☆پیٹھ پیچھے آپکی بات چلے تو گھبرانا مت کیونکہ بات انہی کی ہوتی ہے جن میں کوئی بات ہوتی ہے۔

نظارہ درمیاں ہے

افسانہ

قرۃ العین حیدر

تارا بائی کی آنکھیں تاروں کی ایسی روشن ہیں اور وہ گردوپیش کی ہر چیز کو حیرت سے تکتی ہے۔ دراصل تارا بائی کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ وہ قحط کی سوکھی ماری لڑکی ہے جسے بیگم الماس خورشید عالم کے ہاں کام کرتے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں، اور وہ اپنی مالکن کے شان دار فلیٹ کے ساز وسامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھتی رہتی ہے کہ ایسا عیش وعشرت اسے پہلے کبھی خواب میں بھی نظر نہ آیا تھا۔ وہ گورکھ پور کے ایک گاؤں کی بال وِدھوا ہے۔ الماس بیگم کے بیاہ کو ابھی تین چار مہینے ہی گزرے ہیں۔ ان کی منگلورین آیا جو ان کے ساتھ میکے سے آئی تھی ''ملک'' چلی گئی تو ان کی بے حد منتظم خالہ بیگم عثمانی نے ایمپلائمنٹ ایکس چینج فون کیا اور تارا بائی پٹ بیجنے کی طرح آنکھیں چھپکاتی کمبالا ہل کے ''اسکائی اسکریپر'' گل نسترن کی دسویں منزل پر آن پہنچیں۔ الماس بیگم نے ان کو ہر طرح قابلِ اطمینان پایا۔

وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتی ہیں اور بیگم صاحب اور ان کے صاحب کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کرتی ہیں۔ تارا بائی صبح کو بیڈ روم میں چائے لاتی ہے۔ بڑی عقیدت سے صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔ جھاڑ پونچھ کرتے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوب صورت چیزوں پر ہاتھ پھیرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔ ان کا وائلن وارڈ روب کے اوپر رکھا ہے۔ جب پہلی بار تارا بائی نے بیڈ روم کی صفائی کی تو وائلن پر بڑی دیر تک ہاتھ پھیرا کی۔ صاحب میم صاحب مس صاحب لوگ کی سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ مگر بیاہ کے بعد سے بیگم صاحب نے ان پر بہت سی پابندیاں لگادی ہیں۔ دفتر جاتے ہیں تو دن میں کئی بار فون کرتی ہیں۔ شام کو کسی کام سے اکیلے باہر جائیں تو بیگم صاحب کو پتہ رہتا ہے کہ کہاں کہاں گئے ہیں اور ان جگہوں پر بھی فون کرتی رہتی ہیں۔ شام کو سیر وتفریح یا ملنے ملانے کے لیے دونوں میاں بیوی باہر جاتے ہیں تب بھی بیگم صاحب بڑی کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ صاحب نے یہ سارے قاعدے قانون ہنسی خوشی قبول کر لیے ہیں کیوں کہ بیگم صاحب بہت امیر ہیں اور صاحب کو نوکری بھی ان کے دولت مند سسر ہی نے دلوائی ہے۔ ورنہ بیاہ سے پہلے صاحب بہت غریب آدمی تھے۔ اسکالرشپ پر انجینئرنگ پڑھنے فرانس گئے تھے۔ واپس آئے تو روزگار نہیں ملا، پریشان حال گھوم رہے تھے۔ جب ہی بیگم صاحب کے گھر والوں نے انہیں پھانس لیا۔ بڑے لوگوں کے یہ عجیب وغریب قصے تارا بائی فلیٹ کے مستری (باورچی)، حمال اور دوسرے نوکروں سے سنتی ہے۔ خورشید عالم بڑے اچھے وائلن نواز بھی تھے۔ مگر جب سے بیاہ ہوا ہے، بیوی کی محبت میں ایسے کھوئے کہ وائلن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کیوں کہ الماس بیگم کو اس ساز سے دلی نفرت ہے۔ خورشید عالم بیوی کے بے حد احسان مند ہیں کیوں کہ اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی۔ یہ صرف ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ الماس اپنے ملک التجار باپ کی عالی شان کوٹھی میں مالا بار ہل پر رہتی تھیں۔ وہ سوشل ورک کر رہی تھیں اور عمر زیادہ ہونے کے کارن شادی کی اُمید سے دست بردار ہو چکی تھیں۔ جب ایک دعوت میں ان کی ملاقات خورشید عالم سے ہوئی اور ان کی جہاں دیدہ خالہ بیگم عثمانی نے ممکنات بھانپ کر اپنے ''جاسوسوں'' کے ذریعہ معلومات فراہم کیں۔ لڑکا یوپی کا ہے۔ یورپ سے لوٹ کر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے، مگر شادی پر تیار نہیں۔ کیوں کہ فرانس میں ایک ''لڑکی'' چھوڑ آیا ہے، اور اس کی آمد کا منتظر ہے، بیگم عثمانی فوراً اپنی مہم میں جٹ گئیں۔

الماس کے والد نے اپنی ایک فرم میں خورشید عالم کو پندرہ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ الماس کی والدہ نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا اور الماس سے ملاقاتیں خود بخود شروع ہو گئیں۔ ایک برس گزر گیا مگر انہوں نے الماس سے شادی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر بیگم عثمانی نے طے کیا کہ خود ہی ان سے صاف صاف بات کر لینا اب عین مناسب ہے۔ مگر

تب ہی پرتاپ گڑھ سے تار آیا کہ خورشید عالم کے والد سخت بیمار ہیں اور وہ چھٹی لے کر وطن روانہ ہوگئے۔ان کو پرتاپ گڑھ گئے چند روز ہی گذرے تھے کہ الماس جواب ان کی طرف سے ناامید ہوچکی تھی ایک شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک جرمن پیانسٹ کا کونسرٹ سننے تاج محل گئی، کرسٹل روم میں حسب معمول بوڑھے پارسیوں اور پارسنوں کا مجمع تھا۔اور ایک بے حد حسین آنکھوں والی پارسی لڑکی کونسرٹ کا پروگرام بانٹتی پھر رہی تھی۔ایک شناسا خاتون نے الماس کا تعارف اس لڑکی سے کرایا۔

''مس پیروجا جہانگیر دستور'' اور خود آگے چلی گئیں۔الماس نے حسب عادت بڑی ناقدانہ اور تیکھی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کا جائزہ لیا۔لڑکی بے حد حسین تھی۔'' آپ کا کیا نام بتلایا مسز رستم جی نے ؟'' الماس نے ذرا مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔'' پیروجا دستور''۔لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔''میں نے آپ کو پہلے کسی کونسرٹ وغیرہ میں نہیں دیکھا۔'' '' میں سات برس بعد پچھلے ہفتے ہی پیرس سے واپس آئی ہوں۔''اب خاص خاص مہمان جرمن پیانسٹ کے ہم راہ سی لاؤنج کی سمت بڑھ رہے تھے۔کمرے میں چائے کی گہما گہمی شروع ہوچکی تھی۔''آیئے یہاں بیٹھ جائیں''۔

پیروجا نے مسکرا کر الماس سے کہا۔وہ دونوں دریچے سے لگی ہوئی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔''آپ تو ویسٹرن میوزک کی ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں''۔الماس نے ذرا رُکھائی سے باتیں شروع کی،''جی ہاں، میں پیرس پیانو کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہی گئی تھی۔'' الماس کے ذہن میں کہیں دور خطرے کی گھنٹی بجی اس نے باہر سمندر کی شفاف نیلی سطح پر نظر ڈال کر دفعتاً بڑے اخلاق اور بے تکلفی سے کہا'' ہاؤ انٹرسٹنگ۔ پیانو تو ہمارے ہاں بھی موجود ہے کسی روز آکر کچھ سناؤ''۔''ضرور'' پیروجا نے مسرت سے جواب دیا۔سنیچر کے روز کیا پروگرام ہے تمہارا؟ میں اپنے ہاں ایک ہین پارٹی کر رہی ہوں، سہیلیاں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''''آئی وڈ لوٹو کم تھینک یو!''''تم رہتی کہاں ہو، پیروجا؟'' پیروجا نے تاردیو کی ایک گلی کا پتہ بتایا۔الماس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ تاردیو مفلوک الحال پارسیوں کا محلہ ہے۔سنیچر کے روز پیروجا الماس کے گھر پہنچی، جہاں مغنیوں کی پارٹی اپنے عروج پر تھی۔اب کمرے کے ایک کونے میں غالباً بطور آرائش اسٹین وے کا گرینڈ پیانو رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں اب ریڈیو گرام پر ہیری بیلافونٹ کا پرانا کلپسو''جمیکا فیرویل'' بجا رہی تھیں۔الماس چپ چاپ جا کر بالکنی میں کھڑی ہوگئی۔ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے اندر آکر پیروجا سے کہا۔''ہم لوگ سخت بدمذاق ہیں ایک ماہر پیانسٹ یہاں بیٹھی ہے اور ہم ریکاڈ بجا رہے ہیں! چلو بھائی اُٹھو'' پیروجا مسکراتی ہوئی جا کر پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔''کیا سناؤں؟ میں تو صرف کلاسیکل میوزک ہی بجاتی ہوں۔''''ہائے، پوپ (Pop) نہیں؟''

لڑکیوں نے غل مچایا''اچھا کوئی انڈین فلم سونگ بجاؤ۔'' ''فلم سونگ بھی مجھے نہیں آتے مگر مگر ایک غزل یاد ہے جو مجھے جو مجھے۔'' وہ جھینپ کر ٹھٹک گئی۔پیروجا نے پردوں پر اُنگلیاں پھیریں پھر اس نے آہستہ آہستہ ایک دل کش دُھن بجانا شروع کی۔''گاؤ بھی ساتھ ساتھ۔'' لڑکیاں چلائیں۔''بھئی میں گا نہیں سکتی۔میرا اُردو تلفظ بہت خوف ناک ہے۔'' ''اچھا اس کے الفاظ بتادو ہم لوگ گائیں گے۔'' ''وہ کچھ اس طرح ہے۔'' پیروجا نے کہا۔''تو سامنے ہے اپنے بتلا کہ تو کہاں ہے، کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے''۔چند لڑکیوں نے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا''نظارہ درمیاں ہے نظارہ درمیاں ہے۔''

اگلے دو ہفتوں میں الماس نے پیروجا سے بڑی پکی دوستی گانٹھ لی، اس دوران میں پیروجا کو ایک کانونٹ کالج میں پیانو سکھانے کی ملازمت مل چکی تھی جو تعطیلات کے بعد کھلنے والا تھا۔ہفتے میں تین بار ایک امریکن کی دس سالہ لڑکی کو پیانو سکھانے کا ٹیوشن بھی اسے مل گیا تھا۔امریکن کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور وہ اپنا غم بھلانے کے لیے اپنے بچوں کے ہم راہ بغرض سیاحت ہندوستان آیا ہوا تھا اور جوہو سن اینڈ سینڈ میں مقیم تھا۔ایک روز وہ الماس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے باغ میں ٹہل رہی تھی کہ فوارے پر پہنچ کر الماس نے اس سے دفعتہ سوال کیا''تم نے وہ غزل کہاں سے سیکھی تھی؟ وہی جو تم اس روز گا رہی تھیں؟''''اوہ وہ؟ پیرس میں!'' ''پیرس! ہاؤ انٹرسٹنگ! کس نے سکھائی؟''''میرے منگیتر نے۔''''کیا نام ہے صاحب زادے کا؟''''کھورشید عالم۔'' اس نے جواب دیا۔ چند لحظوں کے سکوت کے بعد اس نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں۔سیاہ ساڑی میں ملبوس، کمر پر ہاتھ رکھے سیاہ اُونٹ کی طرح اس

کے سامنے کھڑی الماس اس سے کہہ رہی تھی۔ ''کیسا عجیب اتفاق ہے پیروجا ڈیر! میرے منگیتر کا نام بھی خورشید عالم ہے، وہ بھی وائلن بجاتے ہیں وہ بھی پیرس سے آئے ہیں اور ان دنوں اپنے والد سے ملنے وطن گئے ہوئے ہیں۔'' اگست کے آسمان پر زور سے بجلی چمکی۔ مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کڑکتی ہوئی بجلی ان کر پیروجا دستور پر گر گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا ''اچھا بھئی الماس، منگنی مبارک ہو۔ خدا حافظ۔'' وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھاٹک سے نکلی۔ سڑک کی دوسری طرف اسی وقت بس آن کر رکی تھی، وہ تیزی سے سڑک پار کر کے بس میں سوار ہوگئی۔ اس واقع کے تیسرے روز خورشید عالم کا خط الماس کے والد کے نام آیا۔ جس میں انہوں نے اپنے ابا میاں کی شدید علالت کی وجہ سے رُخصت کی معیاد بڑھانے کی درخواست کی تھی۔ جواب میں الماس نے خود انہیں لکھا۔ ''آپ جتنے دن چاہیں وہاں رہیئے۔ ڈیڈی آپ کو غیر تو نہیں سمجھتے۔ ''برسبیل تذکرہ کل میں سوئمنگ کے لیے سن اینڈ سینڈ گئی تھی۔ وہاں ایک بڑی دل چسپ پارسن مس پیروجا دستور سے ملاقات ہوئی جو پیانو بجاتی ہے اور پیرس سے آئی ہے، اور شاید کسی امریکن کی گرل فرینڈ ہے اور شاید اسی کے ساتھ سن اینڈ سینڈ میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے لکھا کہ غالباً آپ بھی اس سے کبھی ملے ہوں پیرس میں۔۔ آپ کی مخلص الماس شام پڑے تاردیو کی ایک خستہ حال عمارت کے سامنے ٹیکسی آن کر رُکی اور خورشید عالم باہر اُترے۔ اور عمارت کے لب سڑک برآمدے کی دھنسی ہوئی سیڑھی پر قدم رکھا۔ سامنے ایک بوڑھی پارسن سرخ جارجٹ کی ساڑی پہنے، سر پر رومال باندھے منڈیا ہلاتی اندر سے نکلی۔ ''مس دستور ہیں؟'' ''پیروجا؟'' پارسن نے دُھندلی آنکھوں سے خورشید عالم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جو ہوگئیسن اینڈ سینڈ'' کیا؟ کیا مس! دستور سن اینڈ سینڈ میں منتقل ہوگئی ہیں؟'' بہری پٹ ضعیفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''کس کے کس کے ساتھ؟'' خورشید عالم نے ہکلا کر پوچھا۔ بوڑھی غڑاپ سے اندر گئی اور ایک وزٹنگ کارڈ لا کر خورشید عالم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کارڈ پر امریکن کا نام درج تھا۔ جس روز الماس اور خورشید عالم کی منگنی کی دعوت تھی ایسی ٹوٹ کے بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہوگئے۔ الماس کے والد کے دوست ڈاکٹر صدیقی جو حال ہی میں تبدیل ہو کر بمبئی آئے تھے، بالکنی میں جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں گیلری میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے اندر آ کر الماس سے کہا ''خورشید صاحب کے لیے فون آیا ہے۔'' دلہن بنی ہوئی الماس لپک کر فون پر پہنچی۔ ایک مقامی ہسپتال سے ایک نرس پریشان آواز میں دریافت کر رہی تھی ''کیا مسٹر عالم وہاں موجود ہیں؟'' ''آپ بتایئے آپ کو مسٹر عالم سے کیا کام ہے؟'' الماس نے درشتی سے پوچھا۔ ''مس پیروجا دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔ آج ان کی حالت زیادہ نازک ہے زیادہ نازک ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہلوایا ہے کہ اگر چند منٹ کے لیے مسٹر عالم یہاں آسکیں۔'' ''مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں۔'' ''آر یو شیور؟'' ''یس آئی ایم ویری شیور۔'' الماس نے گرج کر جواب دیا۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں؟'' اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔ اور ذرا سراسیمگی سے مہمانوں میں آ شامل ہوئی۔ دو گھنٹے بعد پھر فون آیا۔ ''ڈاکٹر صدیقی آپ کی کال۔''

گیلری میں سے کسی نے آواز دی۔ ''آپ کو فوراً ہسپتال بلایا گیا ہے۔'' ڈاکٹر صدیقی جلدی سے ٹیلیفون پر گئے۔ پھر انہوں نے الماس کو آواز دی۔ ''بھئی معاف کرنا مجھے بھاگنا پڑ رہا ہے۔ تارابائی اپنے روشن آنکھوں سے صاحب کے گھر کی ہر چیز کو ارمان اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ وہ صاحب کو حیرت سے تکا کرتی ہے۔ الماس بیگم اب اُمید سے ہیں۔ بہت جلد تارابائی کا کام دوگنا ہوجائے گا۔ آج صبح صبح آئی اسپیشلسٹ ڈاکٹر صدیقی آئے تھے۔ جب تارابائی چائے لے کر برآمدے میں گئی تو وہ چونک پڑے اور خوشی سے پوچھا۔ ''ارے تارادائی تم یہاں کام کر رہی ہو؟'' ''جی داگدر صاحب۔'' تارابائی نے شرما کر جواب دیا۔ ''اب صاف سمجھائی دیتا ہے؟'' ''جی داگدار صاحب اب سب کچھ صاف سجھائی دیتا ہے۔'' ''گڈ۔'' پھر وہ مسٹر و مسز خورشید عالم سے مخاطب ہوئے۔ ''بھئی یہ لڑکی دس سال کی عمر میں اندھی ہوگئی تھی مگر خوش قسمتی سے اس کا اندھا پن عارضی ثابت ہوا۔ تمہیں یاد ہے الماس! تمہاری انگیج منٹ پارٹی کی رات مجھے ہسپتال بھاگنا پڑا تھا؟ وہاں ایک خاتون مس پیروجا دستور کا انتقال ہوگیا تھا۔ انہوں نے مرنے سے چند روز قبل اپنی آنکھیں آئی بنک کو ڈونیٹ کرنے کی وصیت کی تھی۔ لہٰذا ان کے مرتے ہی مجھے فوراً بلایا گیا کہ ان کی آنکھوں کے ڈیلے نکال لوں۔ بے حد نرگسی

آنکھیں تھیں بے چاری کی۔ جانے کون تھی غریب، ایک بہری بھنڈ پارسن پلنگ کے سرہانے کھڑی بری طرح روئے جارہی تھی۔ بڑا المناک منظر تھا۔ خیر تو چند روز بعد اس تارابائی کا ماموں اسے میرے پاس لایا۔ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ نیا کورنیا لگانے سے اس بچی کی بینائی واپس آسکتی ہے، میں نے وہی مس دستور کی آنکھیں ذخیرے میں سے نکال کر ان کا کورنیا اس لڑکی کی آنکھوں پر گرافٹ کردیا۔ دیکھوں کیسی تارا ایسی آنکھیں ہوگئیں اس کی۔ واقعی میڈیکل سائنس آج کل معجزے دکھا رہا ہے۔

''ڈاکٹر صدیقی نے بات ختم کر کے اطمینان سے سگریٹ جلا لیا ہے۔ مگر الماس بیگم کا چہرہ بھیانک ہوگیا ہے۔ خورشید عالم لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھ کر جیسے اندھوں کی طرح ہوا میں کچھ ٹٹولتے ٹٹولتے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ تارابائی ان کی یہ کیفیت دیکھ کر بھاگی بھاگی اندر جاتی ہے تو صاحب پلٹ کر باؤلوں کی طرح اسے تکنے لگتے ہیں۔ تارابائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ بوکھلائی ہوئی باورچی خانے میں جا کر برتن دھونے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ دور برج خموشاں پر گدھ اور کوے منڈلا رہے اسی طرح منڈلا رہے ہیں۔ کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس دوئی نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس۔

(بشکریہ ماہنامہ تریاق اکتوبر ۲۰۱۶)

سوچو خدارا سوچو

بیالوجی کے ماہرین کہتے ہیں کہ موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی ایک جاندار کے جسم میں موجود 30 ٹریلیّن خلیے Dead ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اور ہر مُردہ خلیئے پر ایک ''بیکٹیریا'' مسلّط ہوجاتا ہے۔ اس مقصد کیلئے انسانی آنت میں 37 ٹریلیّن بیکٹیریاز ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ اس عمل کو ''ڈی کمپوزیشن'' کہا جاتا ہے۔ یہ بیکٹیریاز مردہ سیل کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں اور کاربوہائیڈریٹس، لیپڈ اور پروٹین کو بدبو آور گیسز میں تبدیل کرنے لگتے ہیں۔ یہ بدبو مکھیوں اور دوسرے حشرات الارض کیلئے اشتہاء کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ یہ قدرتی فوج مل جل کر چند ہی روز میں مردہ جسم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔ بچی کھچی ہڈیاں بھی وقت کے ساتھ ساتھ مٹی بن جاتی ہیں۔ یہ وہی جسم ہے جسے صبح سے شام تک سنوارا جاتا ہے۔ کھلایا پلایا جاتا ہے۔ جو چیز باقی بچتی ہے، اور جس تک کسی بیکٹیریا یا حشرات کی پہنچ نہیں، وہ روح ہے۔ یہ وہی روح ہے جسے صبح سے شام تک تڑپایا جاتا ہے۔ اور بھوکا رکھا جاتا ہے۔ (بشکریہ عاصی صحرائی)

مسلمان بادشاہوں کا انجام

راناعبدالرزاق خان لندن

ہمارے مسلمان نہ معلوم کونسی تاریخ بتا کر اپنے سیاسی اکابرین کے رُتبے بلند کرتے رہتے ہیں۔ اگر تاریخ کو غیر جانبداری سے کھنگالا جائے نہ ہی ان کے روّیوں میں کوئی اسلام نظر آیا اور نہ اب موجودہ سیاستدانوں میں کوئی اسلام نظر آتا ہے۔ جب بھی کوئی اقتدار کی جنگ ہوئی تو ان سب نے اسلامی تعلیمات کو یکسر بالائے طاق رکھ کر اپنی سلطنت اور اقتدار کو بچایا۔ نہ حقوق اللہ یاد رہے نہ حقوق العباد، نہ کوئی پیرو مرشد کی پہچان رہی اور نہ بہن بھائی کی اور نہ والدین کی، نہ آلِ رسول کی پہچان رہی، پہچان رہی تو اقتدار کی، تخت کے لئے سب ظلم روا رکھے گئے اور آج کے اسلامی ممالک میں بھی اسی سنت پر عمل ہو رہا ہے۔ ہر قسم کا ظلم روا رکھا جاتا ہے، جب بھی کوئی اقتدار کا مسئلہ آتا ہے نہ عدلیہ انصاف کرتی ہے اور نہ اسلامی علماء کوئی مداخلت کرتے ہیں بلکہ بھیگی بلی بن کر تماشہ دیکھتے ہیں۔

چار خلفائے راشدین میں سے تین اپنے عوام ہی سے قتل ہوئے۔ پُرامن انتقال اقتدار صرف دو کے حوالے سے ہو سکا۔ جمہوریت کو دن رات گالی دینے والے بھول گئے کہ چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد موروثی سلسلہ شروع ہوگیا۔ جو ایک دو مسلمان ملکوں کو چھوڑ کر آج تک چل رہا ہے۔ عباسیوں نے امویوں کی لاشوں پر قالین بچھائے اور ضیافت اُڑائی۔ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبل کے ساتھ ''خلافت'' نے کیا سلوک کیا؟ ان فرشتہ صفت علم و عمل کے میناروں کو جیلوں میں رکھا گیا۔ زہر دیا گیا، بازار اکھیڑ دیئے گئے۔ اُونٹوں پر سوار کرا کے شہروں میں تحقیر کے لئے پھرایا گیا۔ امریکی جمہوریت کو گالی دیتے یہ بھول گئے کہ ''خلافت'' عثمانیہ میں فتوے دیئے تھے کہ جو ''سلطان'' تخت نشین ہوگا۔ اس لئے بھائیوں کو قتل کرنا جائز ہے۔ بصورت دیگر تخت نشینی کی جنگوں میں کئی ہزار مسلمان مارے جائیں گے۔ خلافتِ عثمانیہ کیا تھی؟ باپ کے بعد اس کا بیٹا پھر اُس کا بیٹا، پھر اُس کا بیٹا، پھر اُس کا بیٹا۔ ایران کے صفویوں سے لے کر برّ صغیر کے مغلوں تک، سب خاندانی حکمرانیاں تھیں۔ شاہ جہان آٹھ سال قید رہا، اکثر مسور پکوا تا

تھا کہ اس میں زہر کی ملاوٹ مشکل ہے اورنگ زیب کو تخت حاصل کرنے کے لئے پانچ سال تک جنگیں لڑنا پڑیں۔ بھائیوں اور بھتیجوں میں سے کچھ کو تلوار سے اور کچھ کو قید میں رکھ کر پوست پلا پلا کر مارا۔

امریکی جمہوریت فراڈ ہے تو آپ ہی دنیا کو کوئی نیا نظام دے دیتے۔اپنے گریبان میں جھانکیئے، ماضی کو چھوڑیئے، آج کے دور میں آپ کے ہاں اس لعنتی جمہوریت کا نعم البدل کیا ہے؟ مراکش سے لے کر بحرین تک موروثی بادشاہت! کیا اس پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں؟ نسل سعود کی حکومت خلافتِ عثمانیہ سے بغاوت اور فرنگی کی اطاعت سے وجود میں آئی جو آج بھی امریکن پٹھو بن کر عالم اسلام کے مفادات کو کچل رہی ہے۔ سارے فتنے اسی سے نکل رہے ہیں۔شاہِ ایران بھی زبردستی نکالا گیا، اور خلافتِ عثمانیہ تو مصطفیٰ کمال پاشا نے ختم کی۔

قذافی 1969 میں آیا اور 2011 میں ذلیل ہو کر مرا۔تب تخت خالی ہوا۔یہ 42 سال کا عرصہ بنتا ہے۔زین العابدین 2011 تک 24 سال تیونس کا حکمران رہا۔جمال عبدالناصر 14 سال اقتدار سے چمٹا رہا، مگر مر کر ہی جان چھوڑی۔پھر انوا السادات 11 سال حکمران رہا۔مر کر ہی جان چھوڑی، دنیا کی تاریخ میں یہ اصول پہلی بار طے ہوا ہے کہ اگر کوئی اسلامی نظام چاہتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ صدر ضیاء الحق اتنے سال برسر اقتدار رہیں گے ۔پھر اپنے مکروہ کردار کے باعث (فرعونی امیر الفاسقین) واصلِ جہنم ہونگے۔دس سال حکومت کرنے والا مشرف آج ملک میں پاؤں نہیں دھر سکتا۔رہی پاکستانی جمہوریت، تو اس میں پی پی پر قیادت باپ کے بعد بیٹی کی ہے، پھر خاوند کی، پھر بیٹے کی، مسلم لیگ میں جمہوریت یہ ہے کہ شہزادی، بادشاہ کی غیر حاضری میں سفراء سے ملتی ہے۔کس حیثیت سے؟ حمزہ شہباز کا پروٹوکول دیکھ کر جمہوریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امویوں، عباسیوں، قاچاریوں، صفویوں اور مغلوں کو چھوڑیئے۔ آج کے مسلمانوں کے نظام ہائے حکومت پر غور کیجیئے۔اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں:

مکاری و عیاری و غداری و ہیجان
اب بنتا ہے ان چار عناصر سے مسلمان
قاری اسے کہنا تو بڑی بات ہے یارو!
اس نے تو کبھی کھول کے دیکھا نہیں قرآن
کردار کا گفتار کا اعمال کا مومن
سرحد کا ہے مومن کوئی بنگال کا مومن
ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مومن
بیباکی و حق گوئی سے گھبراتا ہے مومن
مکاری و روباہی پہ اِتراتا ہے مومن
جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا ڈر ہو
وہ رزق بڑے شوق سے کھاتا ہے مومن
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں

وفائے محبت

ایک دن طوطا بولا مجھے چھوڑ کر کبھی بھاگ تو نہیں جاؤ گے۔مینا اُڑ جاؤں تو پکڑ لینا طوطا میں تمہیں پکڑ نہیں سکتا۔مینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اُس نے اپنے پنکھ توڑ دیئے اور بولی اب ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے ایک دن بہت زور سے طوفان آیا۔مینا طوطے سے بولی تم اُڑ جاؤ میں نہیں اُڑ سکتی۔طوطا اپنا خیال رکھنا کہہ کر اُڑ گیا۔جب طوفان تھما اور وہ واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ مینا مر چکی ہے اور ایک ڈال پر لکھا تھا کاش وہ ایک بار تو کہتا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا تو شاید میں طوفان آنے سے پہلے نہ مرتی۔مہربانی کر کے اُن کا خیال رکھیں۔جو آپ سے پیار کرتے ہیں۔ہمیشہ لوگوں کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو کیونکہ اکثر لوگوں کے آنسوؤں میں خوشی اور مسکراہٹ میں غم چھپا ہوتا ہے۔

جلدی

ایک آدمی اپنی بیوی کی قبر پر بیٹھا رو رہا تھا اور قبر کو پنکھے سے ہوا دے رہا تھا۔کسی نے کہا واہ یار کیا محبت ہے؟۔آدمی بولا مرنے سے پہلے میری بیوی کہہ گئی تھی کہ میری قبر کی مٹی خشک ہونے سے پہلے دوسری شادی مت کر لینا۔پتہ نہیں کون کمینہ پانی لگا جاتا ہے۔

(بشکریہ۔عاصی صحرائی)

حکمت کے موتی

ثقلین مبارک

کلاس روم طلبہ اور طالبات سے بھرا ہوا تھا۔ ہر کوئی خوش گپیوں میں مصروف تھا، کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی، اتنے میں پرنسپل کلاس روم میں داخل ہوئے، کلاس روم میں سناٹا چھا گیا۔ پرنسپل صاحب نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ ہمارے کالج کے وزیٹنگ پروفیسر، پروفیسر انصاری ہیں، آپ مفکر دانشور اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ آپ کو کامیاب زندگی گزارنے کے کچھ گر بتائیں گے۔ ان کے کئی لیکچر ہوں گے۔ جو اسٹوڈنٹس انٹرسٹڈ ہوں وہ ان کے لیکچر میں باقاعدگی سے شریک ہوں۔

سبق نمبر 1

کلاس روم میں سناٹا طاری تھا۔ طلبا کی نظریں کبھی پروفیسر کی طرف اُٹھتیں اور کبھی بلیک بورڈ کی طرف۔ پروفیسر کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سوال تھا ہی ایسا وزیٹنگ پروفیسر انصاری نے ہال میں داخل ہوتے ہی بغیر ایک لفظ کہے بلیک بورڈ پر ایک لمبی لکیر کھینچ دی۔ پھر اپنا رُخ طلبا کی طرف کرتے ہوئے پوچھا:''تم میں سے کون ہے جو اس لکیر کو چھوئے بغیر اسے چھوٹا کردے؟''.....''یہ ناممکن ہے۔''، کلاس کے ایک ذہین طالبعلم نے آخر کار اس خاموشی کو توڑتے ہوئے جواب دیا۔''لکیر کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے مٹانا پڑے گا اور آپ اس لکیر کو چھونے سے بھی منع کر رہے ہیں۔'' باقی طلبا نے بھی گردن ہلا کر اس کی تائید کردی۔ پروفیسر نے گہری نظروں سے طلبا کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے بلیک بورڈ پر اس لکیر کے نیچے ہی اس سے بڑی ایک اور لکیر کھینچ دی۔ اب اوپر والی لکیر کے سامنے یہ لکیر چھوٹی نظر آرہی تھی۔ پروفیسر نے چاک ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا: آپ نے آج اپنی زندگی کا ایک بڑا سبق سیکھا ہے، وہ یہ ہے دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر، ان کو بدنام کیے بغیر، ان سے حسد کیے بغیر، ان سے اُلجھے بغیر ان سے آگے کس طرح نکلا جاسکتا ہے.....آگے بڑھنے کی خواہش انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دوسرے کو چھوٹا بنانے کی کوشش کی جائے۔ مگر ایسی صورت میں انسان خود بڑا نہیں ہوتا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں سے اُلجھے بغیر خود کو طاقتور اور بڑا بنانے پر توجہ دی جائے۔ دوسروں سے اُلجھے بغیر آگے بڑھنا، ترقی کا صحیح طریقہ ہے۔ یہ طریقہ فرد کے لیے بھی بہتر ہے اور قوموں کے لیے بھی۔ اس طریقے پر اجتماعی طور پر ہمارے پڑوسی ملک چین نے سب سے زیادہ عمل کیا ہے اور بہترین نتائج حاصل کیے ہیں۔

سبق نمبر 2

دوسرے دن کلاس میں داخل ہوتے ہی پروفیسر انصاری نے بلیک بورڈ پر ایک بڑا سا سفید کاغذ چسپاں کردیا، اس کے بعد انہوں نے اس سفید کاغذ کے درمیان میں مارکر سے ایک سیاہ نقطہ ڈالا، پھر اپنا رُخ کلاس کی طرف کرتے ہوئے پوچھا:''آپ کو کیا نظر آرہا ہے.....؟''

سب نے ہی یک زبان ہو کر کہا''ایک سیاہ نقطہ''۔ طالب علم تعجب کا اظہار کر رہے تھے سر بھی کمال کرتے ہیں، کل لکیر کھینچی تھی آج نقطہ بنا دیا ہے ..... پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا'' حیرت ہے! اتنا بڑا سفید کاغذ اپنی چمک اور پوری آب و تاب کے ساتھ تو تمہاری نظروں سے اوجھل ہے، مگر ایک چھوٹا سا سیاہ نقطہ تمہیں صاف دکھائی دے رہا ہے؟'' زندگی میں کئے گئے لاتعداد اچھے کام سفید کاغذ کی طرح ہوتے ہیں جبکہ کوئی غلطی یا خرابی محض ایک چھوٹے سے نقطے کی مانند ہوتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت دوسروں کی غلطیوں پر توجہ زیادہ دیتی ہے لیکن اچھائیوں کو نظر انداز کردیتی ہے۔ آپ کی ساری زندگی کی اچھائیوں پر آپ کی کوئی ایک کوتاہی یا کسی غلطی کا ایک سیاہ نقطہ ان کو زیادہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ آپ آدھا گلاس پانی کا بھر کر اگر 100 لوگوں سے پوچھیں گے، تو کم از کم 80 فیصد کہیں گے آدھا گلاس خالی ہے اور 20 فیصد کہیں گے کہ آدھا گلاس پانی ہے .....دونوں صورتوں میں بظاہر فرق کچھ نہیں پڑتا لیکن درحقیقت یہ دو قسم کے انداز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت۔ جن لوگوں کا انداز فکر منفی ہوتا ہے وہ صرف منفی رُخ سے چیزوں کو دیکھتے جبکہ مثبت ذہن کے لوگ ہر چیز میں خیر تلاش کر لیتے ہیں۔ ہماری زندگی کے معاملات میں لوگوں کے ردّعمل گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔'لوگ کیا کہیں گے'' جیسے روائتی جملے ہمیں ہمیشہ دوراہوں پر گامزن کردیتے ہیں۔ یہ دوراہی

فیصلہ لینے میں سب سے بڑی رُکاوٹ بن جاتی ہے۔اس صورتحال میں صرف نفسیاتی اُلجھن کا شکار ہوکررہ جاتے ہیں۔اس لیے آپ مستقل میں کوئی بھی کام کریں،کوئی بھی راہ چنیں،تو یہ یادرکھیں کہ آپ ہر شخص کو مطمئن نہیں کرسکتے۔

سبق نمبر 3

تیسرے دن پروفیسر نے اپنی کلاس کا آغاز کرتے ہوئے ایک گلاس اُٹھایا،جس کے اندر کچھ پانی موجود تھا۔انہوں نے وہ گلاس بلند کردیا تاکہ تمام طلبا اسے دیکھ لیں۔''سر کیا آپ وہی فلسفیانہ سوال تونہیں پوچھنا چاہ رہے کہ گلاس آدھا خالی ہے یا آدھا بھرا ہوا ہے''ایک طالب علم نے جملہ کستے ہوئے کہا۔پروفیسر نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور کہا ''نہیں! آج میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے خیال میں اس گلاس کا وزن کیا ہوگا.....؟''''پچاس گرام''،''سو گرام''،''ایک سو پچیس گرام''۔سب اپنے اپنے انداز سے جواب دینے لگے۔''میں خود صحیح وزن بتانہیں سکتا،جب تک کہ میں اس کا وزن نہ کرلوں!.....''پروفیسر نے کہا۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ'' کیا ہوگا اگر میں اس گلاس کو چند منٹوں کے لیے اسی طرح اُٹھائے رہوں.....؟''

''کچھ نہیں ہوگا!''طالب علموں نے جواب دیا۔''ٹھیک ہے،اب یہ بتاؤ کہ اگر میں اس گلاس کو ایک گھنٹے تک یوں ہی اُٹھائے رہوں تو پھر کیا ہوگا.....؟''پروفیسر نے پوچھا۔''آپ کے بازو میں درد شروع ہوجائے گا۔'' طلباء میں سے ایک نے جواب دیا۔''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔'' پروفیسر نے تائیدی لہجے میں کہا۔''اب یہ بتاؤ کہ اگر میں اس گلاس کو دن بھر اسی طرح تھامے رہوں تو پھر کیا ہوگا.....؟''''آپ کا بازو شل ہوسکتا ہے۔''ایک طالب علم نے کہا۔''آپ کا پٹھا اکڑ سکتا ہے''ایک اور طالب علم بولا،''آپ پر فالج کا حملہ ہوسکتا ہے۔آپ کو ہسپتال لازمی جانا پڑے گا!'' ایک طالب علم نے جملہ کسا اور پوری گلاس قہقہے لگانے لگی۔''بہت اچھا!'' پروفیسر نے بھی ہنستے ہوئے کہا پھر پوچھا''لیکن اس دوران کیا گلاس کا وزن تبدیل ہوا.....؟''''نہیں۔'' طالب علموں نے جواب دیا۔''تو پھر بازو میں درد اور پٹھا اکڑنے کا سبب کیا تھا.....؟''پروفیسر نے پوچھا۔طالب علم چکرائے گئے۔'' گلاس کا بہت دیر تک اُٹھائے رکھنا،بہتر ہوگا کہ اب گلاس نیچے رکھ دیں!'' ایک طالب علم نے کہا۔''بالکل صحیح!.....'' اُستاد نے کہا۔''ہماری زندگی کے مسائل بھی کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

آپ انہیں اپنے ذہن پر چند منٹ سوار رکھیں تو وہ ٹھیک لگتے ہیں۔انہیں زیادہ دیر تک سوچتے رہیں تو وہ آپ کے لیے سر کا درد بن جائیں گے۔انہیں اور زیادہ دیر تک تھامے رہیں تو وہ آپ کو فالج زدہ کردیں گے۔آپ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔دیکھئے.....!اپنی زندگی کے چیلنجز (مسائل) کے بارے میں سوچنا یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔لیکن.....اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہر دن کے اختتام پر سونے سے پہلے ان مسائل کو ذہن سے اُتار دیا جائے۔اس طریقے سے آپ کسی قسم کے ذہنی تناؤ میں مبتلا نہیں رہیں گے۔اگلی صبح آپ تروتازہ اور اپنی پوری توانائی کے ساتھ بیدار ہوں گے اور اپنی راہ میں آنے والے کسی بھی ایشو،کسی بھی چیلنج کو آسانی سے ہینڈل کرسکیں گے۔لہٰذا گلاس کو یعنی مسائل پر غیر ضروری سوچ بچار کو نیچے کرنا رکھنا یاد رکھیں۔''

سبق نمبر 4

پروفیسر نے کہا کہ کل ہر ایک طالب علم پلاسٹک کا ایک شفاف تھیلا اور ٹماٹر ساتھ لائے۔جب طلباء تھیلا اور ٹماٹر لے آئے تو پروفیسر نے کہا کہ ''آپ میں سے ہر طالب علم اس فرد کے نام پر جسے آپ نے اپنی زندگی میں معاف نہیں کیا،ایک ایک ٹماٹر چن لیں اور اس پر اس فرد کا نام اور تاریخ لکھ کر اسے اپنے پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالتے جائیں۔'' سب نے ایک ایک کرکے یہی عمل کیا، پروفیسر نے کلاس پر نظر ڈالی تو دیکھا بعض طالب علموں کے تھیلے خاصے بھاری ہوگئے۔پھر پروفیسر نے سب طالب علموں سے کہا کہ''یہ آپ کا ہوم ورک ہے،آپ سب ان تھیلوں کو اپنے ساتھ رکھیں،اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لیے پھریں۔رات کو سوتے وقت اسے اپنے بیڈ کے سرہانے رکھیں،جب کام کررہے ہوں تو اسے اپنی میز کے برابر میں رکھیں۔کل ہفتہ،پرسوں اتوار ہے آپ کی چھٹی ہے،پیر کے روز آپ ان تھیلوں کو لے کر آئیں اور بتائیں آپ نے کیا سیکھا۔'' پیر کے دن سب طالب علم آئے تو چہرے پر پریشانی کے آثار تھے،سب نے بتایا کہ اس تھیلے کو ساتھ ساتھ گھسیٹے پھرنا ایک آزار ہوگیا۔قدرتی طور پر ٹماٹروں کی حالت خراب ہونے لگی۔وہ پلپلے اور بدبودار ہوگئے تھے۔پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا''اس ایکسرسائز سے کیا سبق سیکھا.....؟''سب طلبہ و طالبات خاموش رہے۔''اس ایکسرسائز سے یہ واضح ہوا کہ روحانی طور پر

ہم اپنے آپ پر کتنا غیر ضروری وزن لادے پھر رہے ہیں۔ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم اپنی تکلیف اور اپنی منفی سوچ کی کیا قیمت چکا رہے ہیں۔ہم اکثر یہ سوچتے ہیں کہ کسی کو معاف کر دینا، کسی پر احسان کرنا اس شخص کے لیے اچھا ہے لیکن دوسرے کو معاف کر کے ہم خود اپنے لیے لاتعداد فوائد حاصل کرتے ہیں۔جب تک ہم کسی سے ناراض رہتے ہیں، اس کے خلاف بدلہ لینے کے لیے سوچتے ہیں اس وقت تک ہم کسی اور کا نہیں بلکہ خود اپنا خون جلاتے ہیں۔اپنے آپ کو اذیت اور مشقت میں مبتلا رکھتے ہیں۔بدلے اور انتقام کی سوچ، گلے سڑے ٹماٹروں کی طرح ہمارے باطن میں بدبو پھیلانے لگتی ہے۔معاف نہ کرنا ایک بوجھ بن کر ہمارے اعصاب کو تھکا دیتا ہے۔

سبق نمبر 5

''آج ہم نہیں پڑھیں گے.....'' پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔سارے طالب علم حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔'' آپ دو دن ٹماٹروں کا تھیلا اُٹھائے تھک گئے ہوں گے۔اس لیے آج آپ کے لیے چائے کافی میری طرف سے.....''اسی دوران لیکچر ہال میں کالج کا Peon داخل ہوا اس کے ہاتھ میں کافی کے دو بڑے سے جگ تھے۔ساتھ ہی بہت سے کپ تھے، پورسلین کے کپ، پلاسٹک کے کپ، شیشے کے کپ، ان میں سے بعض سادہ سے کپ تھے اور بعض نہایت قیمتی، خوبصورت اور نفیس..... پروفیسر نے تمام طالب علموں سے کہا کہ''سب اپنی مدد آپ کے تحت وہ گرما گرم چائے کافی آپ خود لے لیں۔''

جب تمام طالب علموں نے اپنے چائے اور کافی کے کپ ہاتھوں میں لے لیے تو پروفیسر صاحب گویا ہوئے۔'' آپ لوگ غور کریں .....تمام نفیس، قیمتی اور دیکھنے میں حسین کافی کپ اُٹھا لیے گئے ہیں، جبکہ سادہ اور سستے کپوں کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا، وہ یوں ہی رکھے ہوئے ہیں۔''''اس کا کیا مطلب سر''۔ایک طالب علم نے پوچھا''گو یہ عام سی بات ہے کہ آپ اپنے لیے سب سے بہترین کا انتخاب کرتے ہیں لیکن یہی سوچ آپ کے کئی مسائل اور ذہنی دباؤ کی جڑ بھی ہے۔'' سارے طالب علم چونک اُٹھے،'' یہ کیا کہہ رہے ہیں سر اچھی چیز کا انتخاب تو اعلیٰ ذوق کی علامت ہے۔یہ مسائل کی جڑ کیسے.....؟'' پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا:'' آپ سب کو حقیقت میں جس چیز کی طلب تھی، وہ چائے یا کافی تھی.....نہ کہ کپ.....لیکن آپ سب نے دانستہ طور پر بہتر کپوں کے لیے ہاتھ بڑھایا اور سب ایک دوسرے کے کپوں کو چور نگاہوں سے دیکھتے رہے۔''

میرے بچو.....نوجوانو..... یاد رکھو.....زندگی کا اصل حسن باطن سے پھوٹنے والی خوشیوں کی وجہ سے ہے۔عالی شان بنگلہ، قیمتی گاڑی، دائیں بائیں ملازمین، دولت کی چمک دمک کی وجہ سے بننے والے دوست یہ سب قیمتی کپ کی طرح ہیں۔اگر اس قیمتی کپ میں کافی یا چائے بدمزہ ہو تو کیا آپ اسے پئیں گے؟۔اصل اہمیت زندگی، صحت اور آپ کے اعلیٰ کردار کی ہے۔باقی سب کانچ کے بنے ہوئے نازک برتن ہیں، ذرا سی ٹھیس لگنے سے یہ برتن ٹوٹ جائیں گے یا ان میں کریک آجائے گا۔یاد رکھیے! دنیا کی ظاہری چمک دمک کی خاطر اپنے آپ کو مت گرائیے بلکہ زندگی کے اصلی جوہر کو اُبھاریے۔تمام تر توجہ صرف کپ پر مرکوز کرنے سے ہم اس میں موجود کافی یعنی زندگی سے لطف اندوز ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں۔لہٰذا کپوں کو اپنے ذہن کا بوجھ نہ بنائیں.....اس کی بجائے کافی سے لطف اندوز ہوں۔''سبق نمبر 6۔پروفیسر صاحب نے کلاس کا آغاز کرتے ہوئے اپنی جیب سے ایک پینسل نکالی اور تمام طلبا کو دکھاتے ہوئے کہا:'' آج کا سبق آپ اس پینسل سے سیکھیں گے.....پینسل میں پانچ باتیں ایسی ہیں جو ہم سب کے لیے جاننی ضروری ہیں!.....'' وہ کیا سر.....''سب نے تجسس سے پوچھا۔'' پہلی بات: یہ پینسل عمدہ اور عظیم کام کرنے کے قابل اس صورت میں ہوسکتی ہے، جب وہ خود کو کسی کے ہاتھ میں تھامے رکھنے کی اجازت دے۔دوسری بات: ایک بہترین پینسل بننے کے لیے وہ بار بار تراشے جانے کے تکلیف دہ عمل سے گزرتی ہے۔تیسری بات: وہ ان غلطیوں کو درست کرنے کی اہل رکھتی ہے، جو اس سے سرزد ہوسکتی ہیں۔چوتھی بات: یہ پینسل کا سب سے اہم حصہ ہمیشہ وہ ہوگا جو اس کے اندر یعنی اس کے باطن میں ہوتا ہے اور پانچویں بات۔پینسل کو جس سطح پر بھی استعمال کیا جائے، وہ لازمی اس پر اپنا نشان چھوڑ جاتی۔ چاہے حالات کیسے ہی ہوں۔''''اب اس پینسل کی جگہ آپ اپنے کو لے لیں۔آپ بھی عمدہ اور عظیم کام کرنے کے لیے قابل اسی صورت میں ہوسکتے ہیں، جب آپ خود کو اپنے استاد یا راہنما کے ہاتھوں میں تھامے رکھنے کی اجازت دیں۔دوسری بات: آپ کو بار بار تراشے جانے کے تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑے گا۔ یہ مراحل دنیا میں زندگی کے مختلف

مسائل کی صورت میں آپ کے سامنے آئیں گے، ایک مضبوط فرد بننے کے لیے آپ کو ان مسائل کا اچھے طریقے سے سامنا کرنا ہوگا۔ تیسری بات: یہ کہ اپنے آپ کو ان غلطیوں کو درست کرنے کے قابل بنائیں جو آپ سے سرزد ہوسکتی ہیں۔ چوتھی بات: ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ ہمارے اندر ہے، ہمارا باطن ہے، ہمیں اسے کثافتوں اور آلائشوں سے بچانا ہے۔ پانچویں بات: آپ جس سطح پر سے بھی گزر کر جائیں، آپ اپنے نشان ضرور چھوڑ جائیں۔ چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ اس یقین کے ساتھ زندگی بسر کریں کہ اس دنیا کو آپ کی ضرورت ہے کیونکہ کوئی شے بھی فضول اور بے مقصد نہیں ہوتی۔

سبق نمبر 7

پروفیسر صاحب نے کلاس میں داخل ہوتے ہوئے اپنے طالب علموں پر نظر ڈالی اور کہا'' آج میں تمہیں زندگی کا نہایت اہم سبق سکھانے جارہا ہوں.....'' وہ اپنے ہمراہ کانچ کی ایک بڑی برنی یعنی جار JAR لائے تھے، انہوں نے اس جار کو ٹیبل پر رکھا اور اپنے بیگ سے ٹیبل ٹینس کی گیندیں نکال کر اس برنی میں ڈالنے لگے.....اور تب تک ڈالتے رہے جب تک اس برنی میں ایک بھی گیند کی جگہ باقی نہ رہی..... پروفیسر صاحب نے طالب علموں سے پوچھا'' کیا برنی پوری بھر گئی ہے.....؟ ''جی ہاں.....' طالب علموں نے ایک ساتھ جواب دیا.....پھر پروفیسر صاحب نے بیگ سے چھوٹے چھوٹے کنکر نکال کر اس برنی میں بھرنے شروع کردیے، وہ دھیرے دھیرے برنی کو ہلاتے بھی جارہے تھے۔ کافی سارے کنکر برنی میں جہاں جگہ خالی تھی سما گئے..... پروفیسر صاحب نے پھر سوال کیا'' کیا اب برنی بھر گئی ہے.....؟'' طالب علموں نے ایک بار پھر ''ہاں'' کہا.....اب پروفیسر صاحب نے بیگ سے ایک تھیلی نکالی اور اس میں سے ریت نکال کر دھیرے دھیرے اس برنی میں ڈالنی شروع کردی، وہ ریت بھی اس برنی میں جہاں تک ممکن تھا بیٹھ گئی..... یہ دیکھ کر طلباء اپنی نادانی پر ہنسنے لگے..... پروفیسر صاحب نے ایک بار پھر سوال کیا'' کیا اب یہ برنی پوری بھر گئی ہے ناں.....؟'' ''جی!.....اب تو پوری بھر گئی ہے سر.....'' سب ہی نے ایک آواز میں کہا..... پروفیسر نے بیگ کے اندر سے جوس کے دو ڈبّے نکال کر جوس اس برنی میں ڈالا، جوس بھی ریت کے بیچ تھوڑی سی جگہ میں جذب ہوگیا .....اب پروفیسر صاحب نے نہایت ہی گھمبیر آواز میں سمجھانا شروع کیا.....'' اس کانچ کی برنی کو تم لوگ اپنی زندگی سمجھو، ٹیبل ٹینس کی گیندیں تمہاری زندگی کے سب سے اہم کام ہیں.....مثلاً طرزِ معاشرت، حصولِ معاش، تعلیم وتربیت، خاندان، بیوی بچے، نوکری، صحت وتحفظ وغیرہ چھوٹے کنکر تمہاری عام ضروریات اور خواہشات ہیں۔ گاڑی، بنگلہ، نوکر چاکر، موبائل، کمپیوٹر اور دیگر اصرافِ زندگی وغیرہ.....اور ریت کا مطلب ہے چھوٹی چھوٹی بیکار اور فضول باتیں، جھگڑے، آوارہ گردی، ہوائی قلعہ بنانا، ٹائم پاس کرنا، وقت کا ضیاع وغیرہ.....اگر تم نے کانچ کی برنی میں سب سے پہلے ریت بھری ہوتی تو ٹیبل ٹینس کی گیند اور کنکر کے لیے جگہ ہی نہیں بچتی یا صرف کنکر بھر دیئے ہوتے تو گیند نہیں بھر پاتے، ریت ضرور آسکتی تھی.....ٹھیک یہی طریقہ کار زندگی پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر تم فضول اور لایعنی چیزوں کے پیچھے پڑے رہو گے اور اپنی زندگی اسی کے چکر میں ختم کردو گے تو تمہارے پاس اہم باتوں کے لیے وقت نہیں رہے گا.....ایک کامیاب اور پرسکون زندگی گزارنے کے لیے یہ اہم سبق ہے۔ اب یہ تم خود طے کرلو کہ تمہیں اپنی کانچ کی برنی کس طرح بھرنی ہے''.....طالب علم بڑے غور سے پروفیسر صاحب کی باتیں سن رہے تھے، اچانک ایک طالبعلم نے پوچھا ''سر! لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ جوس کے دو ڈبّے کیا ہیں؟''..... پروفیسر مسکرائے اور بولے'' میں سوچ ہی رہا تھا کہ ابھی تک کسی نے یہ سوال کیوں نہیں کیا.....اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں ہم کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں اور کس قدر ہی کامیابیاں کیوں نہ سمیٹ رہے ہوں لیکن اپنے گھر والوں، دوستوں کیساتھ تعلق کی مٹھاس کی گنجائش ہمیشہ رکھنی چاہیے''

سبق نمبر 8

آج لیکچر کا آخری دن تھا، کلاس روم کے طلبہ میں چہ میگوئیاں جاری تھیں، اتنے میں پروفیسر صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے، کلاس روم کی بھنبھناہٹ آہستہ آہستہ گہری خاموشی میں بدلنے لگی۔ دیکھا کہ پروفیسر کے پیچھے ایک غبارے والا ڈھیر سارے سرخ رنگ کے کلاس روم میں داخل ہورہا ہے..... پروفیسر کے اشارے پر غبارے والے نے ایک ایک کرکے سارے غبارے طلباء میں تقسیم کردیئے.....'' سر آج ویلنٹائن ڈے نہیں ہے.....'' ایک طالب علم نے جملہ کسا۔'' سر! کیا آپ کی سالگرہ ہے؟''

ایک اور طالب علم بولا۔ پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا:'' آپ میں سے ہر ایک کو مارکر کا استعمال کرتے ہوئے ان غباروں پر اپنا نام لکھنا ہے ''۔سب نے پروفیسر کی کہنے پر نام لکھ دئے۔اس کے بعد تمام غبارے جمع کرکے دوسرے کمرے میں ڈال دیے گئے۔آپ پروفیسر نے تمام طالب علموں سے کہا کہ''اب سب غباروں والے کمرے میں جائیں اور اپنے اپنے نام والا غبارہ تلاش کریں، دھیان رہے کہ کوئی غبارہ نہ پھٹے اور آپ سب کے پاس پانچ منٹ ہیں۔''ہر کوئی بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے ہوئے، دوسروں کو دھکیلتے ہوئے اپنے نام کا غبارہ تلاش کرنے لگا۔ایک افراتفری کا سماں تھا۔سارے غبارے ایک ہی رنگ کے تھے، پانچ منٹ تک کوئی بھی اپنے نام والا غبارہ تلاش نہ کرسکا..... یہ دیکھ کر پروفیسر انصاری نے کہا کہ اب آپ کے پاس پانچ منٹ ہیں کوئی بھی غبارہ پکڑ لیں اور اس کے نام والے شخص کو دے دیں، دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ تمام افراد کے پاس اپنے اپنے نام والے غبارے تھے۔پروفیسر انصاری کلاس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے''بالکل اسی طرح ہماری زندگی ہے، ہر کوئی بدحواسی کے عالم میں اپنے اردگرد خوشیاں تلاش کر رہا ہے یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کہاں ہیں۔نوجوانو..... یاد رکھو..... ہماری خوشی دوسروں کی خوشی میں پنہاں ہے، ان کو ان کی خوشی دے دیں تو آپ کو آپ کی خوشی مل جائے گی۔'' (ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ)

مسکرایئے اور سیٹی ماریئے

محمد اسحٰق عاجز

پروفیسر صاحب انتہائی اہم موضوع پر لیکچر دے رہے تھے، جیسے ہی آپ نے تختہ سیاہ پر کچھ لکھنے کیلئے رُخ پلٹا کسی طالب علم نے سیٹی ماری۔پروفیسر صاحب نے مڑکر پوچھا کس نے سیٹی ماری ہے تو کوئی بھی جواب دینے پر آمادہ نہ ہوا۔آپ نے قلم بند کرکے جیب میں رکھا اور رجسٹر اٹھا کر چلتے ہوئے کہا؛ میرا لیکچر اپنے اختتام کو پہنچا اور بس آج کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔پھر انہوں نے تھوڑا سا توقف کیا، رجسٹر واپس رکھتے ہوئے کہا، چلو میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں تاکہ پیریڈ کا وقت بھی پورا ہوجائے۔کہنے لگے: رات میں نے سونے کی بڑی کوشش کی مگر نیند کوسوں دور تھی۔سوچا جاکر کار میں پٹرول ڈلوا آتا ہوں تاکہ اس وقت پیدا ہوئی کچھ یکسانیت ختم ہو، سونے کا موڈ بنے اور میں صبح سویرے پیٹرول ڈلوانے کی اس زحمت سے بھی بچ جاؤں۔پھر میں نے پیٹرول ڈلوا کر اُسی علاقے میں ہی وقت گزاری کیلئے ادھر اُدھر ڈرائیو شروع کردی۔کافی مٹرگشت کے بعد گھر واپسی کیلئے کار موڑی تو میری نظر سڑک کے کنارے کھڑی ایک لڑکی پر پڑی، نوجوان اور خوبصورت تو تھی مگر ساتھ میں بنی سنوری ہوئی بھی، لگ رہا تھا کسی پارٹی سے واپس آرہی ہے۔میں نے کار ساتھ جا کر روکی اور پوچھا، کیا میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں؟ کہنے لگی: اگر آپ ایسا کردیں تو بہت مہربانی ہوگی، مجھے رات کے اس پہر سواری نہیں مل پا رہی۔لڑکی اگلی سیٹ پر میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی، گفتگو انتہائی مہذب اور سلجھی ہوئی کرتی تھی، ہر موضوع پر مکمل عبور اور ملکہ حاصل تھا، گویا علم اور ثقافت کا شاندار امتزاج تھی۔میں جب اس کے بتائے ہوئے پتے پر اُس کے گھر پہنچا تو اُس نے

اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اُس نے مجھ جیسا باشعور اور نفیس انسان نہیں دیکھا، اور اُس کے دل میں میرے لیئے پیار پیدا ہوگیا ہے۔میں نے بھی اُسے صاف صاف بتاتے ہوئے کہا، سچ تو یہ ہے کہ آپ بھی ایک شاہکار خاتون ہیں، مجھے بھی آپ سے انتہائی پیار ہوگیا ہے۔ساتھ ہی میں نے اُسے بتایا کہ میں یونیوسٹی میں پروفیسر ہوں، پی ایچ ڈی ڈاکٹر اور معاشرے کا مفید فرد ہوں۔لڑکی نے میرا ٹیلیفون نمبر مانگا جو میں نے اُسے بلا چوں و چرا دیدیا۔میری یونیورسٹی کا سُن کر اُس نے خوش ہوتے ہوئے کہا؛ میری آپ سے ایک گزارش ہے۔میں نے کہا؛ گزارش نہیں، حکم کرو۔کہنے لگی؛ میرا ایک بھائی آپ کی یونیوسٹی میں پڑھتا ہے، آپ سے گزارش ہے کہ اُس کا خیال رکھا کیجیئے۔میں نے کہا؛ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے، آپ اس کا نام بتا دیں۔کہنے لگی؛ میں اُس کا نام نہیں بتاتی لیکن آپ کو ایک نشانی بتاتی ہوں، آپ اُسے فوراً ہی پہچان جائیں گے۔میں نے کہا؛ کیا ہے وہ خاص نشانی، جس سے میں اُسے پہچان لوں گا۔کہنے لگی؛ وہ سیٹیاں مارنا بہت پسند کرتا ہے۔پروفیسر صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ کلاس کے ہر طالب علم کی نظر غیر ارادی طور پر اُس لڑکے کی طرف اُٹھ گئی جس نے سیٹی ماری تھی۔پروفیسر صاحب نے اُس لڑکے کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا، اُٹھ اوئے جانور، تو کیا سمجھتا ہے میں نے یہ پی ایچ ڈی کی ڈگری گھاس چر کر لی ہے کیا؟

-

پاکستانی عدل

عاصی صحرائی

بہت عرصہ پہلے کہتے ہیں کہ طوطے کا ایک جوڑا دن بھر کی مسافت کے بعد رات گزارنے کیلئے ایک ویران گاؤں میں رُکا، گاؤں کی ویرانی دیکھ کر طوطی نے طوطے سے پوچھا ''کس قدر ویران گاؤں ہے، ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا ہے، تمہارے خیال میں یہ گاؤں کسی وجہ سے اُجڑا ہوگا؟'' طوطے نے کچھ دیر سوچا اور طوطی کی طرف دیکھ کر بولا ''میرا خیال ہے اُلوؤں کی وجہ سے'' جس وقت طوطا طوطی کو گاؤں اُجڑنے کی وجہ بتا رہا تھا، عین اس وقت ایک اُلّو بھی وہاں سے گزر رہا تھا، اس نے طوطے کی بات سنی اور وہاں رُک کر ان سے مخاطب ہو کر بولا، تم لوگ اس گاؤں میں مسافر لگتے ہو، لمبے سفر کی وجہ سے تھکے ہوئے بھی ہو، میرا گھر قریب ہے، اس ویران گاؤں میں رات گزارنے سے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آج رات تم لوگ میرے مہمان بن جاؤ، میرے ساتھ ڈنر کرو، آرام سے رات بسر کرو اور صبح اپنی اگلی منزل پر روانہ ہو جانا، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اُلّو کی محبت بھری دعوت سے طوطے کا جوڑا انکار نہ کر سکا اور انہوں نے اُلّو کی دعوت قبول کر لی، دونوں اُلو کے ساتھ اس کے گھر پہنچے، اُلّو نے دونوں کی بہت شاندار اور پر تکلف دعوت کی، تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا اور آرام دہ بستر پر رات گزاری، صبح جب انہوں نے اپنے میزبان اُلو کی مہمان نوازی پر شکریہ ادا کر کے رُخصت ہونے کی اجازت چاہی، تو اُلو نے مسکرا کر طوطے کی طرف دیکھا اور بولا ''میری طرف سے اجازت ہے آپ جا سکتے ہیں، لیکن طوطی نہیں جائے گی'' طوطے نے حیرت سے پوچھا ''کیوں'' اُلو بولا ''اسلیئے کہ یہ طوطی میری بیوی ہے'' طوطا چلایا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے'' تم اُلو ہو اور ہم طوطے ہیں، ایک طوطی اُلّو کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟'' اُلو نے اطمینان سے جواب دیا ''تم مانو یا نہ مانو لیکن یہ طوطی میری بیوی ہے اور میں اپنی بیوی کو تمہارے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

دونوں میں جب بحث و تکرار زیادہ بڑھی تو اُلّو نے طوطے کے کے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا ''ایسا کرتے ہیں ہم تینوں عدالت چلتے ہیں اور اپنا مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں، قاضی جو فیصلہ کرے وہ ہمیں قبول ہوگا...''

اُلّو کی تجویز پر طوطا اور طوطی مان گئے اور تینوں قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے، طوطے نے قاضی کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کیا اور طوطی کو اپنی بیوی قرار دیا، قاضی نے اُلو کی طرف دیکھا، اُلّو بیان دینے کیلئے آگے بڑھا، اس نے حلف اُٹھایا ''میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا'' اس کے بعد اس نے قاضی کے رُوبرو طوطی کو اپنی بیوی قرار دینے کیلئے دلائل دینے شروع کئے، اُلّو کے جواب میں طوطے نے اپنے جوابی دلائل دیئے لیکن بدقسمتی سے اُلّو کے دلائل طوطے کے دلائل سے زیادہ مضبوط اور قوی تھے، چنانچہ قاضی نے دلائل کی روشنی میں اُلّو کے حق میں فیصلہ دے کر عدالت برخاست کر دی، طوطا اس بے انصافی پر روتا رہا، چلاتا رہا، انصاف کی دُہائی دیتا رہا، مگر اس کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ ناکام و نامراد جب طوطا اکیلا جانے لگا تو اُلّو نے اسے آواز دی، ''بھائی اکیلئے کہاں جاتے ہو اپنی بیوی کو تو ساتھ لیتے جاؤ'' طوطے نے حیرانی سے اُلّو کی طرف دیکھا اور بولا ''اب کیوں میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو، یہ اب میری بیوی کہاں ہے، عدالت نے تو اسے تمہاری بیوی قرار دے دیا ہے'' اُلّو نے طوطے کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا اور بولا، میرے بھائی یہ سب ڈرامہ تھا، میں تمہیں عدالت اس لیئے لایا تھا کہ میں تمہیں اُس گاؤں کے اُجڑنے کی اصل وجہ بتا سکوں، جس ملک میں انصاف نہیں ہوگا اور جس ملک کے قاضی بے ایمان اور عدالتیں بے انصاف ہونگی، وہ ملک ویران ہو جائے گا، اگر تم اپنے معاشرے، اپنے گاؤں اور اپنے ملک کو اُجڑنے اور برباد ہونے سے بچانا چاہتا ہے تو ملک میں کبھی بے انصافی نہ ہونے دینا ہے، یاد رکھو میرے بھائی معاشرے، گاؤں اور ملک اُلّوؤں کی نحوست کی وجہ سے نہیں اُجڑتے، بلکہ بے انصافی اور نظام کی خرابی کی وجہ سے اُجڑ جاتے ہیں، نحوست اُلوؤں میں نہیں ہوتی، نحوست ظلم اور بے انصافی اور برے نظام میں ہوتی ہے۔

پاکستانی اور جاپانی پولیس

عبدالقدیر کوکب

یہ واقعہ ڈاکٹر شعیب سڈل نے سنایا 1992ء میں راولپنڈی میں پولیس کا عالمی سطح کا ایک سیمینار ہوا تھا، اس سیمینار میں شرکت کیلئے بیرون ملک سے بے شمار پولیس افسر پاکستان آئے۔ ان افسروں میں جاپان کا پولیس چیف بھی شامل تھا۔ سیمینار کے بعد ڈنر تھا، ڈنر میں راولپنڈی کے ڈی آئی جی اور جاپان کے پولیس چیف ایک میز پر بیٹھ گئے اور دونوں نے گفتگو شروع کر دی، گفتگو کے دوران ڈی آئی جی نے جاپانی چیف سے پوچھا ''آپ لوگوں پر کبھی سیاسی دباؤ نہیں آتا؟'' جاپانی پولیس چیف نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد جواب دیا۔ ''صرف 1963ء میں ایک بار آیا تھا'' ڈی آئی جی صاحب ہمہ تن گوش ہو گئے'' چیف نے بتایا ''1963ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ جاپان کے دورے پر آئے تھے، وہ ایک دن کیلئے اوساکا شہر چلے گئے، دوسرے دن ان کی جاپانی وزیراعظم کے ساتھ ملاقات تھی، انہوں نے اوساکا سے سیدھا پرائم منسٹر ہاؤس آنا تھا، راستے میں ٹریفک جام ہو گئی۔

ان کے ساتھ موجود پروٹوکول افسروں نے ہمارے پولیس چیف سے رابطہ کیا اور ان سے درخواست کی، پولیس کسی خصوصی بندوبست کے ذریعے انہیں ٹوکیو پہنچا دے، پروٹوکول افسروں کا کہنا تھا کہ برطانوی وزیر خارجہ کی وزیراعظم سے ملاقات انتہائی ضروری ہے اگر وہ انہیں وقت پر نہیں ملتے تو یہ ملاقات ملتوی ہو جائے گی کیونکہ ایک گھنٹے بعد وزیراعظم چین کے دورے پر روانہ ہو جائیں گے، پولیس چیف نے ان کی بات سن کر معذرت کر لی، اس کے بعد وزیراعظم نے بذات خود پولیس چیف سے درخواست کی لیکن پولیس چیف کا کہنا تھا ''ہمارے پاس وی آئی پیز کو ٹریفک سے نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں'' یوں یہ ملاقات منسوخ ہو گئی۔ اس ملاقات کی منسوخی کی وجہ سے جاپان اور برطانیہ کے تعلقات میں شدید کشیدگی پیدا ہو گئی'' جاپان کے پولیس چیف خاموش ہو گئے' ہمارے ڈی آئی جی نے شدت جذبات میں پہلو بدلا اور ان سے پوچھا ''اس کے بعد کیا ہوا'' پولیس چیف مسکرائے ''اس کے بعد کیا ہونا تھا، یہ خبر اخبارات میں شائع ہو گئی، لوگوں نے وزیراعظم کے روّیے پر شدید احتجاج کیا اور وزیراعظم کو قوم اور پولیس دونوں سے معافی مانگنا پڑی'' ہمارے ڈی آئی جی کیلئے یہ انوکھی بات تھی چنانچہ انہوں نے حیرت سے پوچھا ''اگر پولیس چیف کے انکار سے وزیراعظم برا منا جاتے اور دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہو جاتی تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا'' پولیس چیف نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا ''پہلی بات تو یہ ہے ہمارا وزیراعظم کبھی پولیس چیف کے ساتھ لڑائی نہ کرتا لیکن بالفرض محال اگر دونوں میں جنگ چھڑ بھی جاتی تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا'' پولیس چیف سانس لینے کیلئے رکا اور سنجیدگی سے بولا ''وزیراعظم کو استعفیٰ دینا پڑتا'' ہمارے ڈی آئی جی صاحب کا رنگ پیلا ہو گیا اور انہوں نے حیرت سے پوچھا ''کیا جاپان میں پولیس چیف اتنا مضبوط ہوتا ہے؟'' جاپانی پولیس چیف نے مسکرا کر جواب دیا ''نہیں ہمارے ملک کا قانون، انصاف اور سلامتی کا نظام بہت مضبوط ہے۔ ہم نے عوام کی حفاظت کیلئے پولیس بنا رکھی ہے، وی آئی پیز کو پروٹوکول دینے کیلئے نہیں۔ لہٰذا جاپان کا ہر شخص جانتا ہے اگر وزیراعظم اور پولیس چیف میں لڑائی ہو گی تو اس میں وزیراعظم ہی کا قصور ہو گا لہٰذا استعفیٰ بھی اسے ہی دینا پڑے گا۔

قارئین قندیل ادب انٹرنیشنل
کی جانب سے نئے سال
2017 کی مبارک
صد مبارک

جب قرآن پہ پابندی لگی

رجل خوشاب

1973 روس میں کمیونزم کا طوطی بولتا تھا بلکہ دنیا تو یہ کہہ رہی تھی کہ بس اب پورا ایشیا سرخ ہوجائے گا ان دنوں میں ہمارے ایک دوست ماسکو ٹریننگ کے لیے چلے گئے وہ کہتے ہے کہ جمعہ کے دن میں نے دوستوں سے کہا کہ چلو جمعہ ادا کرنے کی تیاری کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ یہاں مسجدوں کو گودام بنا دیا گیا ہے ایک دو مساجد کو سیاحوں کا قیام گاہ بنا دیا گیا ہے صرف دو ہی مسجد اس شہر میں بچی ہیں جو کبھی بند اور کبھی کھلے ہوتے ہیں میں نے کہا آپ مجھے مساجد کا پتہ بتا دے میں وہیں چلا جاتا ہوں جمعہ ادا کرنے۔ پتہ لیکر میں مسجد تک پہنچا تو مسجد بند تھی، مسجد کے پڑوس میں ہی ایک بندے کے ساتھ مسجد کی چابی تھی میں نے اس آدمی کو کہا کہ دروازہ کھول دو مسجد کا، مجھے نماز پڑھنی ہے، اس نے کہا دروازہ تو میں کھول دونگا لیکن اگر آپکو کوئی نقصان پہنچا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا، میں نے کہا دیکھیں جناب میں پاکستان میں بھی مسلمان تھا اور روس کے ماسکو میں بھی مسلمان ہی ہوں پاکستان کے کراچی میں بھی نماز ادا کرتا تھا اور روس کے ماسکو میں بھی نماز ادا کروں گا چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ اس نے مسجد کا دروازہ کھولا تو اندر مسجد کا ماحول بہت خراب تھا میں نے جلدی جلدی صفائی کی اور مسجد کی حالت اچھی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بلند آواز سے اذان دی...اذان کی آواز سن کر بوڑھے بچے مرد عورت جوان سب مسجد کے دروازے پہ جمع ہوئے کہ یہ کون ہے جس نے موت کو آواز دی...لیکن مسجد کے اندر کوئی بھی نہیں آیا،...خیر میں نے جمعہ تو ادا نہیں کیا کیونکہ اکیلا ہی تھا بس ظہر کی نماز ادا کی اور مسجد سے باہر آگیا جب میں جانے لگا تو لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کہ میں نماز ادا کر کے باہر نہیں نکلا بلکہ دنیا کا کوئی نیا کام متعارف کروا کر مسجد سے نکلا، ایک بچہ میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ ہمارے گھر چائے پینے آئیں۔ اسکے لہجے میں خلوص ایسا تھا کہ میں انکار نہ کرسکا میں انکے ساتھ گیا تو گھر میں طرح طرح کے پکوان بن چکے تھے اور میرے آنے پہ سب بہت خوش دکھائی دے رہے تھے میں نے کھانا کھایا چائے پی تو ایک بچہ ساتھ بیٹھا ہوا تھا میں نے اس سے پوچھا آپکو قرآن پاک پڑھنا آتا ہے؟ بچے نے کہا جی بالکل قرآن پاک تو ہم سب کو آتا ہے، میں نے جیب سے قرآن کا چھوٹا نسخہ نکالا اور کہا یہ پڑھ کر سناؤ مجھے...بچے نے قرآن کو دیکھا اور مجھے دیکھا پھر قرآن کو دیکھا اور ماں باپ کو دیکھ کر دروازے کو دیکھا پھر مجھے دیکھا۔ میں نے سوچا اس کو قرآن پڑھنا نہیں آتا لیکن اس نے کہا کیوں کہ اسکو قرآن پڑھنا آتا ہے۔ میں نے کہا بیٹا یہ دیکھو قرآن کی اس آیت پہ انگلی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا.... رکھی تو وہ فرفر بولنے لگا بنا قرآن کو دیکھے ہی...مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کہ یہ تو قرآن کو دیکھے بنا ہی پڑھنے لگا میں نے اسکے والدین سے کہا ”حضرات یہ کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے مسکرا کر کہا“ دراصل ہمارے پاس قرآن پاک موجود نہیں کسی کے گھر سے قرآن پاک کے آیت کا ایک ٹکڑا بھی مل جائے تو اس تمام خاندان کو پھانسی کی سزا دے دی جاتی ہے اس وجہ سے ہم لوگ قرآن پاک نہیں رکھتے گھروں میں“ تو پھر اس بچے کو قرآن کس نے سکھایا کیونکہ قرآن پاک تو کسی کے پاس ہے ہی نہیں“ میں نے مزید حیران ہوکر کہا۔ ہمارے پاس قرآن کے کئی حافظ ہیں کوئی درزی ہے کوئی دکاندار کوئی سبزی فروش کوئی کسان ہم انکے پاس اپنے بچے بھیج دیتے ہے محنت مزدوری کے بہانے...وہ انکو الحمد اللہ سے لیکر والناس تک زبانی قرآن پڑھاتے ہیں ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ وہ حافظ قرآن بن جاتے ہے کسی کے پاس قرآن کا نسخہ ہے نہیں اس لئے ہماری نئی نسل کو ناظرہ نہیں آتا بلکہ اس وقت ہمارے گلیوں میں آپکو جتنے بھی بچے دکھائی دے رہے ہیں یہ سب کے سب حافظ قرآن ہیں۔ یہی وجہ ہے جب آپ نے اس بچے کے سامنے قرآن رکھا تو اسکو پڑھنا نہیں آیا ناظرہ کہہ کر لیکن جب آپ نے آیت سنائی تو وہ فرفر بولنے لگا اگر آپ نہ روکتے تو یہ سارا قرآن ہی پڑھ کر سنا دیتا۔ وہ نوجوان کہتا ہے کہ میں نے قرآن کا ایک نہیں کئی ہزار معجزے اس دن دیکھے، جس معاشرے میں قرآن پہ پابندی لگادی گئی تھی رکھنے پہ، اس معاشرے کے ہر ہر بچے بوڑھے مرد عورت کے سینوں میں قرآن حفظ ہوکر رہ گیا تھا میں جب باہر نکلا تو کئی سو بچے دیکھے اوران سے قرآن سننے کی فرمائش کی تو سب نے قرآن سنا دیا، میں نے کہا“ لوگو!...تم نے قرآن رکھنے پہ پابندی لگا دی لیکن جو سینے میں قرآن مجید محفوظ ہے اس پہ پابندی نہ لگا سکے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اللہ پاک کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ○ بے شک یہ ذِکر (قران) ہم نے نازفرمایا ہے۔ اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

امام مہدی کا پاکستان آنا اور 1970 کے انتخابات...
جہلاء مطلق کے قصائص

اے آر راجپوت

پاکستان میں پہلے عام انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کے قریبی دوست اور یحییٰ خان کے وزیر اطلاعات جنرل شیر علی خان ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت اپنے امیر المومنین (مذہبی رہنماؤں کے نزدیک) یحییٰ خان کو یقین دلا رہے تھے کہ انتخابات میں مذہبی جماعتیں ہی حکومت بنائیں گی اور انہیں جنرل یحییٰ خان کے صدر رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ دوسری طرف اخبارات، جن میں خاص طور پر جنگ، پول در پول کے ذریعے پیش گوئی کر رہے تھے کہ انتخابات کے نتیجے میں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی تیسری اور چوتھی پوزیشن پر ہونگی۔ جب انتخابی جلسے شروع ہوئے تو ایک طرف تو چھ نکات اور روٹی، کپڑا اور مکان کے حق میں جلسوں کے لئے بڑے بڑے میدان بھی چھوٹے پڑنے لگے تو دوسری طرف مذہبی جماعتوں کے لئے پانچ ہزار کا مجمع لگانا بھی مشکل ثابت ہونے لگا۔ مذہبی جماعتوں کے لئے عوام کی توجہ کو روٹی سے ہٹا کر قرآن کی طرف مبذول کروانا ضروری ہوگیا۔ چنانچہ ایک ''بہت بڑے جلسے'' میں امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد نے عوام کی اسلامی غیرت کو للکار دیا۔ دائیں ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں روٹی پکڑے سٹیج پر چڑھے اور حاضرین جلسہ سے سوال کیا کہ ''مسلمانو! تمہیں قرآن چاہئے یا روٹی؟'' جواب میں مسلمانوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا۔ ''روٹی''۔ یہ بہت تشویش ناک صورت حال تھی۔

پاکستان بنانے کے مقاصد میں تو روٹی شامل ہی نہ تھی۔ چنانچہ عوام میں پھیلتی گمراہی کو ختم کرنے کے لئے جنرل شیر علی خان اور اس کے مذہبی حواریوں نے نا صرف دو قومی نظریہ تخلیق کیا بلکہ پہلی دفعہ فارسی زبان کے لفظ پاکستان کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا، یعنی

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

دوسری طرف انڈونیشیا کی ایک خاتون زہرہ فونا نے دعویٰ کر دیا کہ اس کے پیٹ میں مہدی آخرالزمان پرورش پا رہے ہیں جس کی مختلف لوگوں نے تصدیق بھی کی۔ عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ بس اب مسلمانوں کے برے حالات کا خاتمہ ہونے ہی والا ہے جس کے بعد پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو عروج حاصل ہوگا اور دشمنان اسلام کا خاتمہ۔ مختلف مسلمان ممالک میں مریم ثانی زہرہ فونا کو سرکاری دعوت پر بلانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

پاکستانی حکومت نے بھی عوام کو گمراہی سے بچانے اور اس کی توجہ روٹی سے ہٹا کر آخرت پر مرکوز کرنے کی خاطر زہرہ فونا کو پاکستان کا سرکاری دورہ کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ زہرہ فونا کی پاکستان آمد کے ساتھ ہی علماء سے اس بات کی تصدیق چاہی گئی کہ خاتون کے پیٹ میں بچہ، واقعی امام مہدی ہی ہیں۔ چنانچہ مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا اوکاڑوی نے باری باری خاتون کی بچہ دانی کے قریب کان لگا اذان سننے کے بعد پورے یقین کے ساتھ بیان جاری کیا کہ اذان کی آواز خاتون کے اندرونی حصوں سے ہی آ رہی ہے اور بس اب امام مہدی کی آمد آمد ہے۔ اس کے بعد امام مہدی کی امامت میں نماز کا سلسلہ شروع ہوا۔ زہرہ فونا کعبے کی طرف ٹانگیں کھولے لیٹ جاتی اور علماء و مشائخ کے علاوہ عام لوگ بھی امام مہدی کی اقتدا میں نماز ادا کرتے۔ لیکن چند ملحد قسم کے ڈاکٹروں کے لئے اس بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ انہوں نے صحیح صورت حال کو جاننے کی ٹھان لی۔ مگر زہرہ فونا ہر دفعہ انہیں چکر دے کر نکل جاتی۔ مسلسل کوشش کے بعد ایک دن ڈاؤ میڈیکل کالج کے ڈاکٹر اسے قابو کر کے معائنہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے اور دوران تفتیش زہرہ فونا کی ٹانگوں کے درمیان پھنسا ہوا انتہا مناٹیپ ریکارڈر برآمد کر لیا۔ اسی روز زہرہ فونا پاکستان سے براستہ انڈیا انڈونیشیا بھاگ گئی اور پاکستانیوں نے مزید ماموں بننے کا عظیم موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

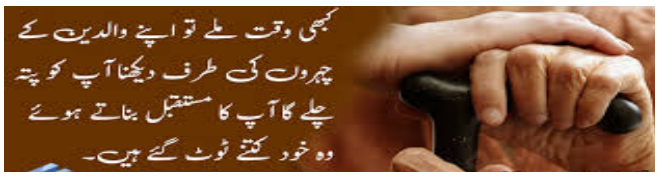

نغموں کا شہنشاہ۔شکیل بدایونی

مشتاق جاوید

کچھ دن قبل جناب معراج احمد معراج نے مشہور ادبی و فلمی شاعر ساحر لدھیانوی کے حوالے سے ایل مضمون لکھا تھا جو کلکتہ کے کئی اخباروں میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں انہوں نے ساحر کی نغمہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں ہندوستانی فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے شاعر کا خطاب سے نوازا تھا نیز موصوف نے مقبول اور مشاہیر نغمہ نگاروں کی فہرست میں مجروح، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی حسرت جےئ پوری، راجہ مہدی علی خاں، نقش لائل پوری اور قمر جلال آبادی کے نام تو دیئے تھے لیکن برصغیر کے سب سے معروف اور با کمال شاعر اور فلمی نغموں کے اہم شاعر حضرت شکیل بدایونی کا نام مذکورہ فہرست میں شامل کرنا بھول گئے یا جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔بلا شبہ ساحر اور مندرجہ بالہ شعراء کو فلمی نغمہ نگاری میں اہم اومعتبر مقام حاصل ہے لیکن شکیل بدایونی جیسے ممتاز اور عظیم شاعر و نغمہ نگار کو فراموش کر دینا سراسر ناانصافی ہے۔شاید معراج کو یہ معلوم نہیں کہ علامہ آرزو لکھنوی۔ڈی این مدھوک، تنویر نقوی اور کیدار شرما کے بعد جس شاعر نے فلمی گیتوں اور نغموں کو بامِ عروج تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا وہ کلاسیکی اور رومانی غزل کے نایاب شاعر شکیل بدایونی تھے۔

کلیات شکیل میں، شکیل صاحب لکھتے ہیں کہ 1945ء کے اوائل میں ایک آل انڈیا مشاعرہ میں ہندوستان کے پیشتر چوٹی کے شعراء نے حصہ لیا تھا مشاعرہ میں نانور فلمی ساز ہدایت کار اے آر کدار اور موسیقار اعظم نوشاد علی بھی موجود تھے۔ارآر اور نوشود صاحب کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی۔انہوں نے مجھے فلموں میں گانے لکھنے کا آفر دیا میں گھبرا گیا کیونکہ اس سے پہلے میں نے فلم کے لئے ایک بھی گیت نہیں لکھا تھا مگو موسیقار نوشاد علی صاحب نے مجھ سے کئی بار کہا کہ شکیل صاحب آپ گھبرایئے نہیں فلم لائن میں آپ کا نام کافی روشن ہو گا۔میرے نغموں کی پہلی فلم درد جب ریلیز ہوئی تو میں نے خود دیکھ لیا کہ پنجاب سے لے کر بنگال تک اور کشمیر سے کنیا کماری تک سبھوں کی زبانوں پر میرے یہی نغمے تھے۔

افسانہ لکھ رہی ہوں دلِ بے قرار کا
آنکھوں میں رنگ بھر کے تیرے انتظار کا
ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی اک شمع جلا دیں گے
بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ..

شاہ مدینہ میں سرخرو ہو گیا۔میری چھاتی چوڑی ہو گئی۔پھر تو نوشاد نے میرے تمام گیتوں کو اپنی سحر انگیز اور دلکش طرزوں میں ڈھال کر امر بنا دیا۔میں نے سطحی گیت لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی جس کا اثر شائقین فلم پر پڑا۔میں نے 1946ء سے 1970ء (اگست تک) تقریباً 75 یا 80 فلموں میں گیت لکھے 1960ء سے لے کر 1962ء تک مسلسل مجھے بہترین نغمہ نگار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔یہ ایوارڈ چودھویں کا چاند، گھرانہ اور بیس سال بعد، کے گیتوں پر ملے۔علاوہ ازیں ملک کے بہت سارے ادبی فلمی اور ثقافتی اداروں نے بھی مجھے بہترین شاعر کی حیثیت سے ایوارڈز دیئے۔ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو فلم مدر انڈیا اور مغل اعظم کے گیت سن کر بہت مسرور ہوئے۔ان فلموں کے خوبصورت گیتوں پر شاباشی دی اور مجھے نغمہ نگار اعظم کے خطاب سے نوازا۔یہ اعزاز آج تک ہندوستان کے کسی دوسرے فلمی شاعر کو نہیں ملا۔بدایوں میونسپل کارپوریشن نے بدایوں اسٹیشن روڈ سے لے کر میرے گاؤں تک کا رڈ شکیل بدایونی روڈ کارپوریشن کے میئر نے اس موقعہ پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ برصغیر ہندو پاک میں اپنی ادبی اور فلمی شاعری کے حوالے سے ہمارے شہر کا نام روشن کیا ہے۔یہ ان کی خدمات کا چھوٹا سا صلہ ہے۔شکیل صاحب کو ایک اور اعزاز حاصل ہے کہ ہندوستان کی زیادہ تر بڑی فلموں کے گانے انہوں نے ہی لکھے۔جن میں امر، مدر انڈیا، بیجو باورا، مغل اعظم، چودھویں کا چاند، میرے محبوب، صاحب بی بی اور غلام۔میلہ، دل لگی، بابل، دیدار، اُڑن کھٹولہ، کوہ نور، لیڈر، گنگا جمنا، گھرانہ، آدمی، دو بدن، رام اور شیام، بے نظیر، نور جہاں اور بیس سال بعد وغیرہ۔شکیل نے موسیقار نوشاد کی بیشتر فلموں کے نغمے لکھے۔ان کے علاوہ انہوں نے کچھ فلموں میں موسیقار غلام محمد، سردار ملک، رومی، خورشید انور، کھیم چندر پرکاش، ایس ڈی برمن، ہیمنت رائے اور روشن کے ساتھ بھی کام کیا۔ان موسیقاروں کے لکھے گئے گیت بھی کافی مقبول ہوئے، شکیل صرف نام کے شکیل نہ تھے بلکہ ہر لحاظ سے شکیل

تھے۔وہ اسم بامسمیٰ تھے۔ایک تو وجیہ اور خوبصورت شخصیت اور اُس پر حسین اور سحر انگیز نغمے انہیں انڈسٹری کے تمام نغمہ نگاروں میں ممتاز کرتے تھے۔ شکیل 1960ء سے 1970ء تک کی دہائی میں سب سے مہنگے شاعر تھے۔وہ اُس زمانہ میں فلم کا گیت لکھنے کے لئے ایک لاکھ روپیہ لیتے تھے۔فلم مغل اعظم جب سپر ہٹ ہوگئی اور فلم نے سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی منائی تو شکیل نے مغل اعظم کے فلم ساز اور ہدایت کار سے گیت لکھنے کا معاوضہ مانگا تو آصف صاحب ایک لاکھ سے کچھ کم معاوضہ دینے لگے۔شکیل نے کم پیسہ لینے سے انکار کر دیا۔آخر کار آصف صاحب نے معاہدہ کے مطابق ایک لاکھ روپے دیئے۔مغل اعظم کے بعد آصف صاحب نے ایک ساتھ دو فلمیں بنانے کا اعلان کیا۔ایک فلم سستا خون مہنگا پانی، دوسری فلم محبت اور خدا دونوں کی موسیقی کے لئے نوشاد صاحب کا انتخاب ہوا لیکن جب آصف صاحب نے ان فلموں میں نغمے لکھنے کے لئے شکیل صاحب سے بات کی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ آصف صاحب شکیل ہی جیسے بڑے شاعر ساحر لدھیانوی کے پاس گئے جب معاوضے کی بات آئی تو ساحر نے ایک فلم کے لئے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا مطالبہ رکھا۔آصف صاحب برہم ہو گئے انہوں نے کہا کہ میں نے فلمی نغمہ نگاری کے سب سے معتبر اور مقبول شاعر شکیل بدایونی کو فلم مغل اعظم کے لئے ایک لاکھ روپے دیئے تھے آپ پچیس ہزار روپے بڑھا کر مانگ رہے ہیں۔ میں آپ کو ایک لاکھ سے زائد نہیں دے سکتا۔ساحر صاحب نرم پڑھ گئے۔ لیکن اب کہ انہوں نے یہ شرط رکھ دی کہ شکیل صاحب سے پانچ روپے زیادہ لوں گا۔آصف صاحب نے ساحر سے کہا کہ میں ایک فلم کے لئے ایک لاکھ سے ایک روپیہ زیادہ نہیں دے سکتا۔اس طرح بات نہیں بن سکی۔آصف صاحب نے سستا خون مہنگا پانی کے گانے حسرت جے پوری سے لکھوائے اور محبت اور خدا کے نغمے خمار بارہ بنکوی نے لکھے۔شکیل کی پہلی فلم درد سے لے کر آدمی اور رام شیام تک تمام فلموں کے گانے جب بھی ہم سنتے ہیں تو ہمارے دل کیف وسرور سے بھر جاتے ہیں۔شکیل ایک اعلیٰ پایہ کے ادبی شاعر تھے اور صوفیانہ کلاسیکی اور رومانی شاعری میں انہیں کمال حاصل تھا۔وہ اپنے شعر میں کہتے ہیں کہ۔

نہ فنا مری، نہ بقا مری مجھے اے شکیل نہ ڈھونڈیئے
میں کسی کے حسن کا خیال ہوں میرا کچھ وجود عدم نہیں

وہی کارواں، وہی راست، وہی زندگی، وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

شہنشاہ جاذبیت دلیپ کمار شکیل صاحب کے فلمی نغمہ نگاری سے متعلق فرماتے ہیں کہ اُن کے فلمی نغموں کا مجموعہ ''دور کوئی گائے'' میری نظروں کے سامنے ہے جسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔وہ جس اعلیٰ درجہ کے ادبی شاعر ہیں اُسی اعلیٰ پائے کے فلمی شاعر بھی ہیں۔علامہ آرزو لکھنوی، تنویر نقوی اور کیدار شرما، نے فلمی گیتوں کو جو بلند مقام عطا کیا تھا شکیل صاحب نے بھی فلمی گیتوں کا وہی وقار وہی مقام اور عظمت بخشی۔وہ 1946ء سے گیت لکھ رہے ہیں۔اس عرصہ میں انہوں نے ہماری فلموں کو بے حد خوبصورت، کافی معیاری اور صحت مند نغمے فراہم کئے ہیں۔میلہ، بابل، آن، دیدار، لیڈر، اُڑن کھٹولہ، امر، کوہ نور، مغل اعظم۔گنگا جمنا، رام شیام، آدمی اور دل اور دل دیا ادرد لیا، کے گیت لافانی ہیں۔ان گیتوں میں لفظوں کی بندش اور حالات کے لحاظ سے الفاظ کا صحیح استعمال اتنا خوبصورت ہے کہ لوگ اسے سن کر مسرور اور بے خود ہو جاتے ہیں۔

شکیل ہندوستانی فلم انڈسٹری کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے گنگا جمنا میں بھوجپوری کو، کوہ نور، بیجو باورا، اور امن میں بھجن لکھ کر ثابت کر دیا کہ انہیں ہر زبان اور علاقائی بولی پر عبور حاصل ہے۔وہ فلموں میں نظمیں اور غزلیں بھی خوب لکھتے رہے۔میں نوشاد صاحب کی جن فلموں میں کام کرتا ہوں تو ان سے یہی کہتا ہوں کہ ان فلموں کے نغمے شکیل صاحب سے لکھوائیں۔شکیل صاحب نے ہماری انڈسٹری کے جو نایاب اور بے جوڑ نغمے دیئے ہیں انہیں خوبصورت دُھنوں سے سجانے اور سنوارنے میں نوشاد صاحب کی ذہانت اور محنت کا بڑا ہاتھ ہے۔شکیل اپنے نغموں کے وسیلہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے کیونکہ اں کے دلکش اور حسن سے لبریز گیتوں نے انہیں فلمی دنیا کا ممتاز شاعر بنا دیا ہے۔وہ ایک منفرد ادبی شاعر بھی ہیں اور دنیائے ادب میں انہیں اہم مقام حاصل ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے فن کو مزید بلندی عطا کرے اور ان گیتوں کے مجموعے ''دور کوئی گائے'' کو کامیابی و کامرانی ملے۔

(دلیپ کمار از شکیل بدایونی)

شکیل بدایونی مذہبی اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔وہ 3 اپریل 1916ء کو مولوی جمیل احمد قادری سوختہؔ کے گھر پیدا ہوئے۔اُن

کے والد محترم ممبئی کے خوجہ سنی مسجد کے پیش امام، نامور عالم دین اور واعظ تھے۔شکیل نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم بدایوں کے مدرسہ سے حاصل کی۔ مولوی جمیل احمد کے عزیز دوست علامہ ضیاء الہدیٰ قادری بدایونی تھے جو نعت منقبت کے بہترین شاعر تھے۔انہوں نے ابتدائی دنوں میں شکیل احمد بدایونی کے کلام پر اصلاح دی چونکہ وہ بدایوں کے نامور صوفی شاعر تھے اس لئے شکیل کے اس دور کی شاعری پر تصوف کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔شکیل کی شادی مولوی قیصر حسن کی بڑی صاحبزادی سلمٰی سے ہوئی۔قیصر حسن صاحب ان کے چچا تھا۔شکیل بدایونی کے چھ بچے ہیں۔

جن کے نام یہ ہیں۔علی قدر، رضیہ، صفیہ، جاوید شکیل طارق شکیل، ہما شکیل، ہما شکیل 20.15 سال قبل شاعری کرتی تھیں اور ان کی غزلیں ملک کے معتبر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔میٹرک کی تعلیم ممبئی سے حاصل کرنے کے بعد شکیل بدایونی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ وہاں پروفیسر رشید احمد صدیقی۔مولانا احسن امروہی، آل احمد سرور، جناب محمد صادق، اور ضیاء بدایونی جیسی نابغہ روزگار ہستیوں سے علم کی روشنی حاصل کی۔ راز مرادآبادی، راز الہ آبادی، جاں نثار اختر، جمیل الرحماں جمیل، امین خان شروانی اور نواب مظفر ریاض الدولہ وغیرہ ان کے احباب اور ہم عصر شعراء تھے۔اس زمانہ میں مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی اور نقش جارپوی نے میدان شاعری میں داخلہ لیا تھا۔مسلم یونی ورسٹی سے بی اے کی ڈگری لینے کے بعد سے 1943ء سے 1944ء تک حکومت ہند کے محکمہ سپلائی میں آفیسر کی حیثیت سے ملازمت کی۔اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو (دہلی) کے اردو ڈیپارٹمنٹ کے پروڈیوسر ہوئے۔1945ء میں ان کا داخلہ انڈین فلم انڈسٹری میں ہوا جہاں شکیل کو جو عزت شہرت اور عظمت ملی اس سے دنیا بخوبی واقف ہے۔اخلاقی طور پر بلند شخصیت کے مالک تھے۔ایک مخلص انسان اور مہمان نواز شخص تھے۔جن لوگوں سے ان کے تعلقات تھے اُن سے آخری وقت تک دوستی نبھائی۔شکیل کثرت سگریٹ نوشی اور سخت زردے والا پان کافی استعمال کرتے تھے جن سے انہیں ٹی بی کا مرض لاحق ہو گیا تھا وہ ذیابطیس کے بھی مریض تھے۔اگست 1970ء میں جب ان کی طبیعت کافی بگڑ گئی تو موسیقار نوشاد اور دلیپ کمار صاحب نے انہیں لیلاوتی ہسپتال میں بھرتی کروادیا اس وقت تک وہ موت کے قریب جا چکے تھے۔ایسے عالم میں اُن کے تمام احباب حتیٰ کے اہلیہ نے بھی منہ پھیر لیا لیکن نوشاد اور دلیپ کمار روزانہ عیادت کو آتے اور ان کے علاج میں بھی ہاتھ بٹاتے اسی دوران دلیپ کمار کو رام اور شیام اور آدمی کی شوٹنگ کے لئے جنوبی ہند جانا پڑا۔

30 اگست 1970ء کو اردو ادب کا یہ جاں باز سپاہی اور فلمی نغمہ نگاری کا شہنشاہ شاعر رومان شکیل بدایونی ہم سے جدا ہو کر خلا کی وُسعتوں میں کھو گیا۔ نوشاد نے ان کی موت پر کہا کہ اب میری دُھنوں پر دلنواز نغمے کون لکھے گا۔وہ میرا دوست نہیں بھائی تھا۔شکیل صاحب کی میت پر پوری فلم انڈسٹری اور ان کے ہزاروں شائقین شامل ہوئے۔

ہسپتال کے بستر پر موت سے کچھ دن قبل شکیل نے ایک نظم اور دو غزلیں کہی تھیں جو حسب ذیل ہیں۔میرے ہی ہم نفس میرے ہم نوا مجھے دوست بن کے دغا نے دے...کہکشاں دور جا کے رکھ دی ہے...آج کی رات میرے دل کی سلامی لے لے 3 نمبر کو نوشاد نے شکیل کی اجازت سے فلم رام اور شیام میں ڈال دی جو کافی مقبول ہوئی۔یہ نظم اور غزل شکیل نے اپنی اہلیہ کی بے رُخی اور غلط رویہ سے تنگ آ کر لکھی تھی۔شکیل نے فلمی نغموں اور ادبی شاعری سے متعلق جو عظیم شعراء ادباء اور نقادوں نے مضامین لکھے ان کے مختصر جملے حاضر خدمت ہیں۔

ا۔جتنی خوبیاں ایک باکمال شاعر میں ہونی چاہئیں وہ سب شکیل میں ہیں۔

علامہ نوح ناروی۔شکیل کی شاعری اور نغمہ نگاری میں کچھ منزلیں آتی ہیں کہ وہ بھرپور جوانیوں ولولوں اور حوصلوں کی شاعری بن جاتی ہے۔

(فراق گورکھ پوری)

شکیل شاعر فطرت ہیں شاعر کاریگر نہیں ہیں، ان کا کلام محض لفظی طلسم بندیوں کا مجموعہ نہیں۔ان کی زندگی ان کی آئینہ دار ہے (جگر مرآد آبادی) جگر اور فراق کے بعد آنے والی نسلوں میں شکیل بدایونی واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے فن کے لئے غزل کا انتخاب کیا۔جس میں ہمارے ماضی کا بہترین ادبی اثاثہ محفوظ ہے۔زندگی اور عشق کے رشتے پر شکیل کی گہری نظر ہے۔ان کی غزلوں اور فلمی نغموں میں بے ساختگی، بے تکلفی اور برجستگی کی شان موجود ہے۔وہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کے سب سے معتبر، عظیم اور ممتاز شاعر ہیں۔

(کیفی اعظمی اور بی آر چوپڑہ)

حاصلِ مطالعہ۔ عاصی صحرائی

پوچھا گیا دعا کے لئے کیا ضروری ہے؟

کہا، دھیان! ''پوچھا'' دھیان کیسے ملے؟ کہا! وجدان سے ،پوچھا! وجدان کیا ہے؟ کہا! سارے وجود کا ایک نقطے پر مرتکز ہو جانا! پوچھا کوئی مثال؟ کہا! کسی ماں سے اُس کا بچہ اوجھل کر دو، اسے اطلاع دے کر بس اتنا کہہ دو کہ اب بس دعا کر۔ پھر دیکھو کہ اس ماں کا وجود کس طرح مجسم دعا بن جاتا ہے۔ حالتِ اضطراب میں ماں کی دعا کی قبولیت کی راہ میں کوئی شہ حائل نہیں ہو سکتی۔

ارحام خان۔ جمائما خان

ایک ہی مرد سے دو مطلقہ عورتیں، دونوں کا تعلق دو مختلف معاشروں سے ہے۔ ایک طلاق کے سات سال بعد اپنے سابقہ شوہر کی ایک نوبل کاز پر حمایت کرنے پاکستان آتی ہے۔ دوسری طلاق کے ایک سال بعد تاریخ نکاح کو متنازعہ بنا کر اپنے سابقہ شوہر کی تذلیل کرنے کے لئے اچانک ٹی وی پر نمودار ہوتی ہے۔ یہ دراصل دو معاشروں کی اخلاقی اقدار کا فرق ہے۔ جبکہ ہم نے عورت کے پورے لباس کو ہی اخلاقی اقدار سمجھ لیا ہے۔

کافر۔ کافر۔ کافر

دنیا میں کوئی کافر نہیں کیونکہ کوئی بھی خود کو کافر نہیں کہتا اور نہ ہی کافر کہلوانا پسند کرتا ہے۔ مگر دنیا میں سب ہی کافر ہیں کیونکہ ہر کوئی کسی نہ کسی کی نظر میں کافر ہے۔ مثلاً اگر میں کسی کو مجبور کروں کہ وہ خود کو کافر کہے۔ تو اس شخص کی نظر میں، میں سب سے بڑا کافر ہوں گا۔ جیسے حکومتِ پاکستان ہے۔

چوروں کی اقسام

چوروں کی دو قسمیں ہیں ایک عام چور۔ دوسرا سیاسی چور۔ عام چور آپ کا مال، آپ کا بٹوہ، آپ کی گاڑی، اور آپ کا موبائل وغیرہ چرا لیتے ہیں۔ مگر سیاسی چور آپ کا مستقبل، آپ کا خواب، آپ کا عمل، آپ کی تعلیم، آپ کی صحت، آپ کی قوت اور آپ کی مسکراہٹیں چھین لیتے ہیں۔ لیکن غور فرمایئے ان میں عجیب و غریب ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ نمبر ا۔ عام چور آپ کا انتخاب کرتا ہے اور ۲۔ سیاسی چوروں کا انتخاب آپ خود کرتے ہیں۔

ناک

ہمارے معاشرے میں ناک ہوتی ہی مردوں کی ہے۔ اور ایسی عجیب کہ کسی کی بہن بیٹی کو چھیڑنے پر نہیں کٹتی اپنی بہن کے چھڑنے پر کٹ جاتی ہے۔ زبردستی کی شادی کروانے پر یا زبردستی طلاق دلوانے پر نہیں کٹتی، مرضی کی شادی اور مرضی کی طلاق پر کٹ جاتی ہے۔ اپنے یا اپنے بیٹے کے کرتوتوں پر نہیں کٹتی، بیٹی یا بہو کی معمولی سی غلطی پر کٹ جاتی ہے۔ بہن کا حق کھا جانے پر نہیں کٹتی، بہن کے حصہ مانگنے پر کٹ جاتی ہے۔ ایسی ناک گردن سمیت کٹ جائے تو بہتر ہے۔

اعترافِ حق

امریکہ کے سپریم کورٹ کا بیان۔ حضرت محمد ﷺ دنیا کی تاریخ کے سب سے اچھے اور بہترین منصف تھے۔

ننگِ انسانیت

ہر سال تین ہزار سے زائد چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اُونٹ دوڑ میں مر جاتے ہیں کسی وحشی عرب بدو کی انا کی خاطر تا کہ اُس کا اُونٹ جیت جائے۔

تاریخ کے جھروکوں سے

پاکستان اور قائداعظم کی پالیسی کے عین مطابق فلسطین کی تقسیم اور اہلِ فلسطین کے ساتھ زیادتی کی بھرپور مخالفت کی اور ایسے دلائل دیئے کہ حمید نظامی کے نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق (۱۲۔اکتوبر ۱۹۴۷) ''سر ظفر اللہ کی تقریر سے اقوام متحدہ کی کمیٹی میں سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔'' ''امریکہ، روس اور برطانیہ کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔'' ''عرب لیڈروں کی طرف سے سر ظفر اللہ خان کو خراجِ تحسین۔'' اور اب ایک حوالہ عوامی انسائیکلو پیڈیا ''پاکستان کرونیکل سے ملاحظہ فرمایئے۔'' ۳۰ اکتوبر (۱۹۴۷): اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے قائد سر ظفر اللہ خان کو اقوام متحدہ کی فلسطین کمیٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا ہے۔ یہ کسی بھی بین الاقوامی پلیٹ فارم پر پاکستان کی پہلی کامیابی تھی۔

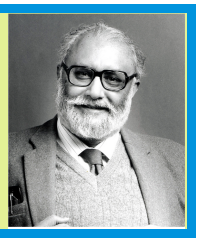

ایک عظیم سائنس دان۔پروفیسر عبدالسلام

قسط: 01

پروفیسر آصف علی پرویز

آصف: ہم ایک عظیم سائنس دان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔ان کا نام پروفیسر عبدالسلام ہے۔لیکن کیا خیال ہے کہ ان کے خاندان اور بچپن سے نہ شروع کروں ۔ میں یہ عرض کر دوں کہ انشاء اللہ بہت سے واقعات بیان کروں گا جو یا تو تحریر شدہ ہیں یا میں نے ان کے بھائی محترم چوہدری عبدالرشید صاحب (جو لندن میں مقیم ہیں) سے براہ راست سنے ہیں۔اس لئے تمام تفاصیل مصدقہ ہیں۔تو کیوں نہ میں آپ کے نانا جان حضرت نبی بخشؓ سے شروع کروں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ممتاز صحابی تھے۔بیعت کرنے والوں میں آپ کا نمبر 181 ہے۔

دوست: یقیناً یہ ان کی شبانہ دعائیں ہی تھیں جن کی قبولیت کے نتیجہ میں بالآخر آپ کے نواسے عبدالسلام کی پیدائش ہوئی جنہوں نے سائنس کی دنیا میں بہت بڑا مقام حاصل کیا۔

آصف: آپکے والد محترم کا نام محمد حسین صاحب تھا۔آپ بہت ہی صاحب توکل بزرگ تھے۔آپ نے خواب میں رہنمائی پاتے ہوئے قادیان جا کر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے ہاتھ پر بیعت کی سعادت پائی۔

آپ تربیت اولاد پر بہت زور دیتے تھے اور انہیں ہر آن اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے۔آپ کو آنحضور ﷺ کی ذات مبارک سے عشق تھا۔آپ جب بھی کسی کاغذ پر دستخط کرتے تو آنحضور ﷺ پر درود شریف پڑھتے کیونکہ آپ کے نام میں محمدؐ آتا تھا۔اس طرح آپ حضرت مسیح موعودؑ کا یہ شعر بطور دعا پڑھتے رہتے

اہل وقار ہوویں، فخر دیار ہوویں
با برگ و بار ہوویں، اک سے ہزار ہوویں

دوست: آپ کو یاد ہوگا کہ جب 1969ء میں MSc کی پہلی کلاس تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں شروع ہوئی تو پروفیسر عبدالسلام صاحب نے اپنے والد کی یاد میں محمد حسین سکالرشپ کا آغاز فرمایا تھا۔

آصف: آپ نے خوب بات یاد دلائی۔مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اپنے نمبروں کی وجہ سے اس سکالرشپ کے ملنے کیلئے پر امید تھا۔اگرچہ وہ تو مجھے نہیں ملا تاہم میں تحدیث نعمت کے طور پر عرض کروں کہ مجھے اسی سال حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی جانب سے لقمان سکالرشپ عطا فرمایا گیا جس کا ذکر الفضل مطبوعہ 19 مارچ 1970ء میں محترم پروفیسر نصیر احمد خان صاحب صدر شعبہ طبیعات نے بعنوان ''لقمان سکالرشپ'' کیا۔فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

دوست: مجھے علم ہے کہ سلام صاحب کے والد گرامی چار سال تک انگلستان میں بھی مقیم رہے اور یہاں آپ نے سو سے زیادہ لیکچر دئے اور نوجوانوں اور بچوں کی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔اب پروفیسر عبدالسلام کی پیدائش کے بارے میں کچھ بتائیے۔

آصف: آپ کے ابا جان بیان کرتے ہیں کہ 3 جون 1925ء کو مسجد میں مغرب کی نماز ادا کرتے ہوئے آخری رکعت میں قرآن کریم کی یہ دعا پڑھی:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿٧٥﴾ (الفرقان:۷۵)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمیں اپنے جیون ساتھیوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے۔

تو انہیں کشف میں ایک لڑکا پکڑا دیا گیا جس کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔نام دریافت کیا تو بتایا گیا کہ اس کا نام عبد السلام ہے۔29 جنوری 1926ء کو آپ کی پیدائش موضع سنتوکھ داس (حال ضلع ساہیوال) میں ہوئی۔

دوست: میں تو ہمیشہ سے یہ ہی سمجھتا تھا کہ آپ جھنگ سے ہیں اور آپ شاید پیدا بھی وہیں ہوئے تھے۔

آصف: آپ کی پیدائش اور اپنے کشف کا ذکر آپ کے ابا جان نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت ایک خط میں لکھا اور نام رکھنے کی درخواست کی تو حضورؓ نے فرمایا:

''جب خدا تعالیٰ نے خود ہی نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں۔''

دوست: یوں لگتا ہے کہ آپ کا وجود ہی خدا تعالیٰ کی جانب سے ایک عظیم انعام تھا جسے خاص ذہانت عطا فرما کر پیدا کیا گیا تھا۔

آصف: آپ کی پیدائش کی اطلاع جب آپ کے ابا جان کے چچا میاں احمد بخش صاحب کو ملی تو اس وقت آپ ایک بچی عزیزہ امتہ الحفیظ کو لوری دے رہے

تھے۔انہوں نے پنجابی میں فی البدیہہ شعر پڑھے۔کیا میں آپ کو سناؤں؟

دوست: کیوں نہیں پنجابی نظم تو استاذی المکرم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب بھی بہت دلچسپی سے پڑھیں گے۔

آصف: وہ شعر یہ ہیں۔

آپا آسیں تے کاکا لیا سیں تو جھولی بہہ کھڈائیں
متھا چمیں بودی چمیں تاڑی مار ہسائیں
ایہہ گل کر بندیاں سنتوکوں چٹھی آئیں
عبد السلام جو پیدا ہوئیا فضل کیتا رب سائیں
چنگا وار جمعے دا بھائی عبد السلام جو آیا
حمد کراں تے شکر کراں رب فضل دا مینہ وسایا

ترجمہ: آپا (سلام صاحب کی والدہ) آئیگی تو لڑکا لائیگی۔تم اسے اپنی گود میں بٹھا کر اس سے کھیلنا۔اس کا ماتھا اور سر چومنا اور تالی بجا کر اسے ہنسانا۔سنتو کھ داس سے خط آیا ہے کہ عبدالسلام پیدا ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے بہت ہی فضل کیا ہے۔ جمعہ کا روز بہت اچھا ہے کہ اس روز عبدالسلام پیدا ہوا ہے۔اللہ کے اس فضل پر اس کی ہزاروں بار حمد اور کروڑوں بار شکر ادا کرتا ہوں۔میرا سر بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہے اور میری کمر دوہری ہوئی ہے۔وہ میرا سہارا بن کر آیا ہے۔اللہ پاک اس کی عمر دراز کرے۔وہ بہت بلند بخت والا ہوگا۔

دوست: کیا ہی محبت بھرا کلام ہے اور آخر میں دعائیہ رنگ میں پیشگوئی بھی ہے کہ عبدالسلام بہت بلند بخت والا ہوگا۔کیا آپ کے پاس ان کی کوئی بچپن کی تصویر ہے۔

آصف: میں نے آپ کے صاحبزادے محترم احمد سلام صاحب جو میرے بڑے گہرے دوست ہیں سے اس کی درخواست کی تو انہوں نے بتایا کہ اس زمانے کی تصویر ان کے پاس نہیں ورنہ میں آپ کو ضرور دکھاتا۔

دوست: ان کے بچپن کی کچھ اور باتیں ہمیں بتائیے۔

آصف: یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپ نے عام بچوں کی نسبت دیر سے بولنا شروع کیا۔طبعاً آپ کے والدین اس کی وجہ سے فکر مند تھے۔انہیں دنوں حضرت مولانا غلام رسول راجیکی صاحبؓ جھنگ تشریف لائے۔آپ کے والد نے ننھے سلام کو ان کی گود میں دیا اور عرض کی کہ سلام بولتا نہیں، اس کیلئے دعا کریں۔آپ نے محبت بھرے پنجابی لہجے میں فرمایا: ''او گونگلو تو بولتا کیوں نہیں۔'' پھر آپ نے نہایت رقت سے دعا کی اور فرمایا ''یہ اتنا بولے گا کہ دنیا سنے گی۔''

دوست: اور واقعی آپ کی یہ بات کیسے اعلیٰ رنگ میں پوری ہوئی۔دنیائے سائنس نے نہ صرف آپ کی زندگی میں آپ کی باتوں کو توجہ سے سنا بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کی تحقیقات سائنس دانوں کیلئے مشعل راہ ہیں۔

آصف: آپ کو یاد ہوگا کہ محلہ دار الرحمت غربی کی مسجد میں ہمیں بھی حضرت مولانا غلام رسول راجیکیؓ سے دعا کی درخواست کرنے کے مواقع ملتے تھے اور آپ کے ساتھ نمازوں میں ملاقات ہوتی تھی۔

دوست: مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے۔

آصف: ڈاکٹر سلام صاحب کے ابا جان بچپن میں آپ کو سائیکل پر بٹھا کر مختلف فیکٹریاں دکھانے لے جاتے۔ان کا مقصد یہ تھا کہ بچپن سے ہی آپ کے دماغ کو وسعت دی جائے۔

دوست: کیا آپ کے ابا جان نے آپ کے مستقبل کے بارے میں کوئی رویا دیکھے؟

آصف: آپ نے رؤیا میں ایک نہایت بلند درخت دیکھا جس کی شاخیں فضا میں بہت دور تک جا رہی تھیں۔آپ نے دیکھا کہ سلام اس درخت پر چڑھ رہا ہے اور بڑی پھرتی سے چڑھتا چلا جا رہا ہے۔یہ دیکھ کر میں ڈرا کہ معصوم بچہ ہے کہیں گر نہ جائے اور اسے زور سے آواز دینے لگا کہ سلام اب بس کرو اور نیچے اترو۔بچہ میری طرف دیکھتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے کہ ابا جان فکر نہ کریں۔یہ کہتے ہوئے پھر اوپر ہی چڑھتا چلا گیا اور پھر اتنی بلندی پر گیا کہ گویا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دوست: یقیناً یہ تو اس طرف اشارہ تھا کہ عبدالسلام ترقی کے انتہائی زینے طے کرے گا۔دوسرا رؤیا کیا تھا؟

آصف: ایک دفعہ آپ نے رؤیا میں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحبؓ کو دیکھا کہ ایک دلفریب بیش قیمت خلعت کو نہایت چمکدار اور خوشنما نقرئی بٹن لگا رہے ہیں۔مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے فرمایا کہ ''عبدالسلام کیلئے خلعت تیار کیا جا رہا ہے''

دوست: تو یہ غالباً اس طرف اشارہ تھا ہ ایک وقت میں آپکو سائنس کا سب سے بڑا یعنی نوبل انعام دیا جائے گا۔

آصف: آپ کی بات صحیح ہے۔یہاں میں ایک واقعہ حلفاً بیان کرنا چاہتا ہوں تا کہ یہ بھی تاریخ احمدیت کا حصہ بن جائے۔1972ء کی بات ہے تعلیم الاسلام کالج کے شعبہ فزکس کے اساتذہ اور MSc کے طلباء پروفیسر نصیر احمد خان صاحب مرحوم کے ہمراہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی خدمت میں

ملاقات کیلئے قصر خلافت ربوہ میں حاضر ہوئے۔حضورؒ نے پروفیسر عبدالسلام صاحب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''آپ کو نوبل انعام ملے گا۔''حضورؒ کا یہ ارشاد سات سال بعد 1979ء میں پورا ہوا۔فالحمدللہ۔حضورؒ نے یہ بھی فرمایا کہ جب پروفیسر عبدالسلام صاحب کسی کانفرنس میں جاتے ہیں تو بڑے بڑے پروفیسر آپ کے اعزاز میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔لیکن بعض کن اکھیوں سے یہ بھی اشارے کرتے ہیں کہ یہ وہ سائنس دان ہے جو اس زمانے میں بھی خدا کو مانتا ہے!

دوست: آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

آصف: آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو بچپن میں گھر میں پڑھایا۔انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ عزیزم سلام انتہائی ذہین بچہ ہے۔وہ آپ کو نئی نئی کہانیاں سناتیں۔اگر کبھی سلام کو پہلے سنائی ہوئی کہانی دوبارہ سنائی جاتی تو وہ فوراً بول اُٹھتا کہ یہ کہانی تو آپ مجھے پہلے ہی سنا چکی ہیں۔ساڑھے چھ سال کی عمر میں آپ کو سکول میں داخل کرایا گیا۔ہیڈ ماسٹر مکرم حافظ امین صاحب نے جائزہ لینے کے بعد ان کو پہلی کلاس کی بجائے چوتھی جماعت میں داخل کیا۔جلد ہی آپ کلاس کے بہترین طالب علم بن گئے۔

دوست: اسے کہتے ہیں 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'

آصف: آپ کے ابا جان نے عبدالسلام کی کلاس میں مقابلہ کا ایک دلچسپ طریق اختیار کیا۔آپ سکول کے استاد کو کچھ رقم دیتے اور کہتے کہ کلاس میں پڑھائی کا مقابلہ کراؤ۔جو بچہ اوّل آئے اسے یہ انعام دینا۔

دوست: میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ضرور یہ انعام عزیزم سلام ہی جیتتے ہوں گے۔

آصف: آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔تاہم کبھی کبھی دو ہندو طلباء بھی یہ انعام لیتے۔ان میں ایک لڑکا تو مدرسہ میں چھابڑی فروش رام پیارا کا بیٹا تھا۔چنانچہ اس طریق سے لائق طلباء میں خوب مقابلہ ہوتا تھا۔عبدالسلام پانچویں سے آٹھویں جماعت تک اپنی کلاس میں اوّل آتے رہے۔مڈل کے امتحان میں عبدالسلام ضلع جھنگ میں اوّل آئے لیکن صوبہ بھر میں آپ کا پانچواں نمبر تھا۔

دوست: آپ کے ابا جان تو یہ نتیجہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

آصف: وہ پوری طرح خوش نہیں تھے۔انہیں امید تھی کہ عبدالسلام پورے صوبہ پنجاب میں اوّل آئے گا۔انہوں نے اوّل آنے والے طالب علم کے پرچے نکلوا کر عبدالسلام کے پرچوں سے موازنہ کرایا۔دونوں کے پرچوں میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔

دوست: کیا آپ انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے ملاقات کیلئے لے کر جاتے تھے؟

آصف: یقیناً۔ایک دفعہ آپ انہیں لے کر،جب ان کی عمر بارہ یا تیرہ برس کی تھی، حضورؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ لڑکا مڈل کے امتحان میں اول آیا ہے اور وظیفہ پر پڑھ رہا ہے۔اب اس نے میٹرک کا امتحان دینا ہے۔آپ اس کیلئے دعا کریں۔حضورؓ نے فرمایا:''میں اس لڑکے کے نوجوان کندھوں پر ایک پختہ عمر کے آدمی کا سر دیکھتا ہوں۔اللہ نے چاہا تو یہ اول آئے گا اور ریکارڈ قائم کرے گا۔''

دوست: حضورؓ کے الفاظ کیسے اعلیٰ رنگ میں اللہ تعالیٰ نے پورے فرمائے۔الحمدللہ۔

آصف: آپ کے ابا جان نے عبدالسلام کو نصیحت کی کہ بچو! آئندہ ہر امتحان میں اوّل آنا ہے۔

دوست: آپ نے اس کے بعد مزید تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

آصف: اتفاق سے انہی دنوں گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ کو انٹرمیڈیٹ کا درجہ دے دیا گیا۔چنانچہ آپ نے میٹرک سے لیکر ایف اے تک وہاں ہی تعلیم حاصل کی۔1940ء میں آپ نے میٹرک کا امتحان صوبہ بھر میں اوّل پوزیشن میں پاس کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔آپ نے 850 نمبروں میں سے 765 نمبر حاصل کئے۔یعنی تقریباً 91 فیصد۔

دوست: یہ جو پگڑی والی تصویر مجھے دکھا رہے ہیں یہ کس موقعہ کی ہے؟

آصف: یہ تصویر اس وقت کی ہے جب آپ نے میٹرک میں اول پوزیشن حاصل کی۔لیکن کیوں نہ آپ کو دلچسپ بات بھی سنا دوں جو خود ڈاکٹر سلام صاحب نے بیان کی۔

دوست: کیوں نہیں!

آصف: آپ بیان کرتے ہیں کہ نتیجہ نکلنے سے ایک دن پہلے آپ حجام کی دوکان پر بال کٹوانے کیلئے گئے۔اس نے آپ کو اپنے ایک شاگرد کے سپرد کیا۔اس نے آپ کے بال اتنے چھوٹے کر دئے کہ آپ کی 'ٹنڈ' نکل آئی۔جسے چھپانے کیلئے انہوں نے پگڑی باندھ لی۔یہ تصویر اخبار میں بھی چھپی جو آپ دیکھ سکتے ہیں۔

دوست: ایک اور دستار فضیلت بھی تو آپ نے اس وقت باندھی جب آپکو نوبل انعام دیا گیا!

آصف: اس کا تفصیلی ذکر تو میں اپنے وقت پر کروں گا۔انشاء اللہ۔اس زمانہ میں بالعموم ہندو یا سکھ طلباء ہی اول آتے تھے اور ادھر عبدالسلام اوّل آئے وہ بھی جھنگ جیسے پسماندہ ضلع سے جہاں اس وقت بجلی بھی نہیں تھی اور عبدالسلام لالٹین کی روشنی میں پڑھتے تھے۔

دوست: آپکو یاد ہوگا کہ ربوہ میں بھی جب بجلی بند ہوتی تھی تو ہمیں لالٹین کی روشنی میں ہی پڑھنا پڑتا تھا۔

آصف: مجھے خوب یاد ہے۔ میں تو چند سال سیرالیون (افریقہ) کے قصبہ باجے بو میں پڑھاتا رہا ہوں جہاں جماعت کا سکول تھا اور ہم لالٹین کی روشنی میں ہی پڑھا کرتے تھے۔

دوست: پڑھنے والوں کیلئے کم روشنی کوئی بہانہ نہیں!

آصف: یہاں میں آپ کو ان کے ابا جان کا ایک اور رؤیا بھی بتا دوں۔آپ نے دیکھا کہ سر سکندر حیات صاحب گورنر پنجاب جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے، آئے ہیں۔انہوں نے پوچھا کہ عبدالسلام کہاں ہے۔آپ نے اپنے گھر میں لگے ہوئے سب سے اونچے درخت کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا جہاں عبد السلام بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے غور سے دیکھا اور پھر چلے گئے۔

دوست: میں تو اس میں آپ کی مزید کامیابیوں کا اشارہ دیکھ رہا ہوں۔

آصف: 1939ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خلافت کو پچیس سال ہو گئے۔جماعت نے تین لاکھ کی خطیر رقم حضورؓ کی خدمت میں پیش کی۔چنانچہ آپ نے ذہین طلباء کے وظائف کیلئے یہ رقم مختص کر دی اور جلسہ سالانہ میں ان وظائف کا اعلان کیا۔اتفاق سے اسی شام جماعت احمدیہ جھنگ کی ملاقات تھی۔عبدالسلام اپنے ابا جان کے ساتھ تھے۔آپ نے حضورؓ کی خدمت میں عرض کی کہ انشاء اللہ عبدالسلام یہ سارے انعامات حاصل کرے گا۔

دوست: کیا آپ کی یہ بات پوری ہوئی؟

آصف: ہوئی اور بڑی شان سے ہوئی جس کی تفصیل اپنے وقت پر بیان ہوتی جائے گی۔میٹرک میں اوّل آنے پر وظیفہ کے علاوہ حضور انور کی طرف سے ایک سو روپیہ انعام سے بھی آپ کو نوازا گیا۔

دوست: کیا آپ نے انٹرمیڈیٹ بھی اسی کالج سے پاس کیا۔

آصف: اگرچہ آپ کے اتنے اعلیٰ نمبر تھے کہ لاہور کے کسی مشہور کالج میں داخلہ ملنا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن آپ نے جھنگ میں ہی مزید پڑھنے کا ارادہ کیا اور ریاضی۔ انگریزی، کیمسٹری، فزکس اور عربی (اختیاری) کا مضمون چنا۔آپ کی عادت تھی کہ کالج ختم ہونے کے بعد آپ کالج میں ہی ٹھہر جاتے اور پڑھائی

کرتے۔

دوست: کیا آپ محض ''کتابی کیڑے'' ہی تھے یا غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لیتے!

آصف: سیکنڈ ائیر میں آپ کو کالج کے رسالہ ''چناب'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔چنانچہ آپ کا اپنی زندگی کا پہلا مقالہ اسی رسالہ میں شائع ہوا۔

دوست: ضرور کوئی حساب کا مسئلہ ہوگا۔

آصف: جی نہیں۔انکا پہلا مقالہ تھا کہ کب مرزا اسداللہ خان غالب نے اپنا تخلص 'اسدؔ' سے 'غالبؔ' کیا۔لازماً آپ کو اس کیلئے بہت تحقیق کرنا پڑی ہوگی۔بعد میں یہی مقالہ مشہور رسالہ 'ہمایوں' میں شائع ہوا اور اس وقت کے اہل علم نے اس مقالہ کی بہت تعریف کی۔

دوست: کیا ایف اے میں انہوں نے اوّل آنے کی روایت برقرار رکھی۔

آصف: ایف اے میں بھی آپ پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔آپ نے 600 میں سے 555 نمبرات حاصل کئے یعنی 92.5% چنانچہ پنجاب یونیورسٹی سے آپ کو 30 روپے اور جماعت احمدیہ کے جوبلی فنڈ سے آپ کو 45 روپے کے ماہوار وظائف دئے جانے لگے اور کالج نے گولڈ میڈل بھی دیا۔

دوست: میں نے آپ کی اس شاندار کامیابی پر جناب عبدالرشید ارشد کی نظم پڑھی ہے۔کیا میں اس کے چند اشعار آپ کو سناؤں۔

آصف: ضرور، ضرور!

دوست:

آؤ عزیزوں آپ کو مژدہ سنائیں آج
ایف اے کے امتحان میں عبد السلام فرسٹ
حیرت زدہ ہیں ممبران یونی ورسٹی
پنجاب کے ریکارڈ کو بھی دی ہے اب شکست
شاباش اے جواں مرد صاحب قومے
رہنا صدا حصول علم کے نشے میں مست
ارشد کی ہے دعا کہ سہل تر کرے خدا
ہوں تمہارے سب زمانے کے بلند و پست

دوست: بعد میں پروفیسر عبدالسلام صاحب نے اپنے اس کالج میں سائنس بلاک بنوایا جس کی تصویر آپ کو دکھا رہا ہوں۔

آصف: انشاء اللہ۔اگلی ملاقات میں آپ کی تعلیم کے بارے میں مزید گفتگو کریں گے۔

--*